قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اپریل 1980

اس پرچہ میں :

ہم نے پاکستان کیوں مانگا تھا؟

(بتقریب یوم پاکستان)

شائع کردہ : ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

قیمت فی پرچہ ۳ تین روپے

ٹیلیفون نمبر ———— ۸۸۰۸۰۰

خط و کتابت

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام بی ۲۵ گلبرگ ۲ - لاہور

بدلِ اشتراک سالانہ
پاکستان -/۳۶ روپے
غیر ممالک -/۳ پونڈ

جلد ۳۳ | اپریل ۱۹۸۰ء | شمارہ ۴

فہرست

۱- لمعات ———————— ۲
۲- حقائق و عبر —— (۱) - ولایت سے آمدہ مبلغِ اسلام) ———— ۱۳
(۲) - عقل و فکر سے کام لینا حرام ہے)
۳- ہم نے پاکستان کیوں مانگا تھا ؟ —— (بتقریب یومِ پاکستان) —— محترم پرویز صاحب —— ۱۸
۴- فہرست معطیانِ قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی ———————— ۴۰
۵- قرآنی درس کے اعلانات وغیرہ ———————— ۴۱
۶- اقبالؒ اور کمیونزم —— (بتقریب یومِ اقبالؒ) ———— ۴۲
۷- اللہ تعالیٰ کا محیرالعقول نظامِ ربوبیت —— (ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب) —— ۶۰
۸- قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی —— (معطیان کی خدمت میں) ———— ۶۴

ایڈیٹر محمد خلیل - ناشر سراج الحق - مقامِ اشاعت بی ۲۵ گلبرگ ۲ - لاہور - پرنٹر شیخ نیاز احمد - مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس ۴ ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

دسمبر ۱۹۷۹ء کے طلوعِ اسلام کے لمعات میں ہم نے پہلے یہ بتایا تھا کہ اسلامی آئین و قوانین کی تدوین کے سلسلہ میں ہم جس روش پر چل رہے ہیں اس کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ اس روش کے مطابق اوّل تو کوئی قوانین مرتب ہی نہیں ہو سکیں گے اور جو مرتب ہوئے وہ ناممکن العمل ہوں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک میں مایوسی پھیل جائے گی اور غیر مسلموں کے دل میں اسلام کے متعلق جو تاثر پیدا ہو چکا ہے (اور بدقسمتی سے وہ تاثر خود ہمارا ہی پیدا کردہ ہے) کہ یہ ایک چلا ہوا کارتوس ہے جو کسی (قدیم) زمانے میں تو نتیجہ خیز ہو گیا ہوگا لیکن اب وہ زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ وہ اور پختہ ہو جائے گا۔ اس یاس انگیز صورتِ حال کا تجزیہ کرنے کے بعد ہم نے لکھا تھا۔

"تشتت و انتشار کے اس یاس انگیز ماحول میں اُمید کی ایک کرن صدرِ مملکت پاکستان کے اس پیغام میں دکھائی دی ہے جو انہوں نے علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کے یومِ پیدائش کی تقریب پر قوم کے نام نشر کیا ہے۔ اس میں انہوں نے کہا ہے :-

> پاکستان کو صحیح معنوں میں اسلامی مملکت بنانے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے سیاسی نظام اور قومی زندگی کے دوسرے شعبوں کا (گہری نظر سے جائزہ لیں)۔ اس مقصد کے حصول کے لئے علامہ اقبالؒ کی فکر میں ہمیں راہنمائی مل سکتی ہے۔ انہوں نے مغربی نظامِ حکومت اور جمہوریت کے تصور پر بار بار تنقید کی ہے اور اسلامی تصورات کو اختیار کرنے کی تاکید اور تلقین۔ ان کا کلام ان اشعار سے بھرا پڑا ہے جن میں انہوں نے مغربی فکر کی تنقیص کی ہے اور جو اسلامی اقدار کے ساتھ ان کے عشق کے آئینہ دار ہیں۔ ہماری بنیادی قومی ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنے اس ملی شاعر اور مفکر کی فکر کی روشنی میں اپنا راستہ متعین کریں۔
>
> (پاکستان ٹائمز۔ مؤرخہ ۹۔ نومبر ۱۹۷۹ء)

رسمی طور پر اس قسم کے الفاظ تو ہم تیس برس سے مسلسل سنتے چلے آ رہے ہیں۔ لیکن مایوسیوں کی ان تاریکیوں میں ایک صدرِ مملکت کی زبان سے یہ الفاظ خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ جیسا کہ معلوم ہے، طلوعِ اسلام ۱۹۳۸ء میں علامہ اقبالؒ کی یاد میں جاری ہوا اور اس کا مقصد قرآن کریم کی روشنی میں فکرِ اقبالؒ کو عام کرنا تھا۔ تقسیمِ ہند سے پہلے دور میں اور تشکیلِ پاکستان کے بعد آج تک یہ مسلسل اور متواتر اسی پیغام کو عام کئے جا رہا ہے۔ اس نے فکرِ اقبالؒ اور پیامِ قرآن مجید کے متعلق جو کچھ شائع کیا ہے۔ اس پر اس ماہنامہ کے ہزاروں صفحات اور اس کی طرف سے شائع کردہ مجلدات شاہد ہیں۔ اصل بات

کہ علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں کے لیے ایک آزاد مملکت ہی کی اسکیم نہیں پیش کی تھی۔ انہوں نے بتایا یہ تھا کہ ایک اسلامی مملکت کے لزوم و خصائص کیا ہوتے ہیں اور وہ کس طرح دنیا کی باقی مملکتوں سے متمیز اور منفرد ہوتی ہے۔ اس تصورِ مملکت کی تائید میں انہوں نے قرآنی دلائل، نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کے بینات اور عہدِ خلافتِ راشدہ کے شواہد نہایت مدلل اور دلنشین انداز میں پیش کئے تھے۔ انہوں نے اپنی فراستِ قرآنی کی رُو سے واضح کر دیا تھا کہ انہیں سمجھنے اور ان کے مطابق اسلامی مملکت کے قائم کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آسکتی۔ ہم اس اجمال کی تفصیلات گزشتہ تیس برس سے پیش کرتے چلے آرہے ہیں۔ لیکن اس وقت ہم قلتِ گنجائش کی وجہ سے ان تفصیلات کو دُہرا نہیں سکتے۔ ذیل کی سطور میں ان کا ایک سرسری سا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد عند الضرورت ان تفصیلات کو بار دیگر بھی سامنے لایا جائے گا۔ تصورِ اقبال کی رُو سے اسلامی مملکت کے حدود اور قیود ذیل کی سطور میں ملاحظہ فرمائیے:۔

حضرات انبیاء کرامؑ کو خدا کی طرف سے ایک ضابطۂ قوانین و آئین عطا ہوتا تھا۔ جو قوم اس ضابطہ کی صداقت کو تسلیم کر لیتی اس کا فریضہ ہوتا تھا کہ وہ اسے عملاً نافذ کرے۔ چونکہ یہ پوری قوم ایک ضابطہ کے تابع زندگی بسر کرتی تھی اس لئے اس میں کسی قسم کے اختلاف اور تفرقہ کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔

رسول کے چلے جانے کے بعد وہ قوم اس ضابطہ میں آمیزشیں کر دیتی اور اس طرح ان میں اختلافات نمودار ہو جاتے اور وہ دین، مذہب بن جاتا۔ یہ جو دُنیا میں مختلف مذاہب پائے جاتے ہیں یوں سمجھئے کہ یہ دین میں پیدا شدہ مختلف فرقے ہیں، کیونکہ دین تو شروع سے آخر تک ایک ہی تھا۔ دین کی اطاعت کرنے والوں میں فرقے پیدا ہو ہی نہیں سکتے۔

یہ دین آخری مرتبہ مکمل اور غیر متبدل شکل میں نبی اکرمؐ کی وساطت سے ملا۔ جن سعادت مند افراد نے اس کی صداقت کو تسلیم کر لیا وہ ایک قوم (یا اُمت) بن گئے۔ اس اُمت نے، اس دین کو عملاً نافذ کرنے کے لئے ایک مملکت کی تشکیل کی جس کا ضابطۂ آئین قرآن کریم تھا۔ اس مملکت کی مرکزی اتھارٹی اُمت کے مشورہ سے اس دین پر عمل پیرا ہونے کے طور طریق وضع کرتی اور انہیں قوانینِ مملکت کی حیثیت سے نافذ کرتی۔ ان کا اطلاق تمام اُمت پر یکساں طور پر ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اس نظام میں، اُمت میں مختلف فرقوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ مختلف فرقوں کے معنی تو یہ تھے کہ مختلف گروہ مملکت کی طرف سے نافذ کردہ قوانین کے بجائے، اپنے اپنے وضع کردہ قوانین کی اطاعت کرتے۔ ایک مملکت کے اندر رہتے ہوئے اس قسم کا طرزِ عمل مملکت سے بغاوت کے مرادف ہوتا ہے یہ وجہ ہے جو قرآن کریم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے۔ (۳۰/۳۲) یعنی ایک اتھارٹی (حکومتِ قرآنی) کی اطاعت کرنے کے بجائے، مختلف اتھارٹیز کی اطاعت کرنا۔ رسول اللہ سے فرمایا گیا کہ جو لوگ فرقے پیدا کر لیں تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں رہے گا۔ (۶/۱۵۹) یعنی جو لوگ مملکتِ اسلامیہ کی مرکزی حیثیت ہی کو تسلیم نہ کریں، ان کا اس مرکز سے تعلق کیا؟ وہ تو اس کے باغی قرار پاتے ہیں۔ چونکہ مرکزِ ملت کے فیصلے قرآن کے مطابق ہوتے تھے، اور فرقوں میں فیصلے اپنی اپنی فقہ کے مطابق ہوتے ہیں، اس لئے کہہ دیا کہ جو لوگ ——— ما انزل اللہ ——— (قرآن مجید) کی رُو سے فیصلے نہیں کرتے انہیں مومن نہیں کہا جا سکتا۔ (۵/۴۴)

ہمارے ساتھ ہوا یہ ہے کہ اُمت کی مرکزی اتھارٹی (حکومتِ خداوندی یا خلافت علیٰ منہاج رسالت) کے باقی نہ رہنے سے دین، مذہب میں تبدیل ہو چکا ہے، اس لئے اس میں مختلف فرقے پیدا ہو چکے ہیں۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ ان فرقوں کو باقی رکھتے ہوئے اسلامی نظام (یعنی دینِ خداوندی) قائم ہو سکتا ہے تو وہ یا تو دین اور مذہب میں فرق

کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور یا پھر اُمت کو فریب میں مبتلا رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ فرقوں کی موجودگی میں دین کا نظام قائم ہی نہیں ہو سکتا۔ دین کا نظام قائم کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے، اور وہ یہ کہ ایک ایسی مملکت کا قیام عمل میں آئے جو قرآنی اصولوں کو مملکت کا آئین قرار دے، اُمت کے مشورہ سے ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے طور طریق وضع کرے۔ انہیں قوانینِ حکومت کی حیثیت سے تمام مسلمانوں پر یکساں نافذ کرے ـــــ اس میں نہ اس فرقے یا اُس فرقے کی کوئی تمیز ہو اور نہ ہی پرسنل اور پبلک لاز کی تفریق ـــــ اس طرح ایک خدا ـــــ ایک ضابطہ قوانین اور ایک اُمت کی تشکیل سے، دین کا نظام قائم ہو گا۔ اگر ایسا نہیں کیا جائے گا تو احیاءِ اسلام کی ہر کوشش رائیگاں جائے گی۔

یہ تھی خلافتِ راشدہ کے بعد اسلامی مملکت کے قیام کی وہ ممکن العمل شکل جسے علامہ اقبالؒ نے پیش کیا اور جس کے مطابق ایک خطۂ زمین کے حصول کے لئے قائدِ اعظمؒ، تحریکِ پاکستان کو وجود میں لائے۔ وہ علامہ اقبالؒ کے پیش کردہ بنیادی اصول کو کس طرح واضح طور پر سمجھ چکے تھے، اس کی تفاصیل طلوعِ اسلام میں متعدد بار پیش کی جا چکی ہیں۔ انہوں نے ان تمام تفاصیل کو ان چند فقروں میں جامع طور پر سمیٹ کر رکھ دیا تھا کہ

> اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی کا نام ہے۔

یہ وہ حدود ہیں جو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہتے ہیں، اور ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، ملت اسلامیہ اپنی مملکت کے لئے قوانین و ضوابط خود وضع کرتی ہے جن کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی مملکت وجود میں نہیں آسکتی، اور اگر وجود میں آجائے تو مستحکم نہیں رہ سکتی، جب تک اس میں ایک (واحد) ضابطۂ قوانین نافذ نہ ہو۔ جس مملکت میں مختلف گروہ اپنے لئے الگ الگ قوانین و ضوابط وضع کرلیں اس میں انارکی پھیل جاتی ہے۔ سیکولر اسٹیٹ میں قانون سازی کا مسئلہ آسان ہوتا ہے۔ اس میں مختلف مذہبی گروہوں کو ان کے اپنے اپنے شخصی قوانین پر عمل پیرا ہونے کی آزادی دے دی جاتی ہے اور پبلک لاز کا ضابطہ، بلا تمیزِ مذاہب، آزادانہ وضع کر لیا جاتا ہے جس کا اطلاق تمام باشندوں پر یکساں ہوتا ہے۔ لیکن اسلام میں نہ تو پرسنل لاز اور پبلک لاز میں تفریق ہوتی ہے اور نہ ہی اس کے پبلک لاز بلا حدود و قیود جس طرح جی چاہے وضع کئے جا سکتے ہیں۔ یہ سب قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے وضع کئے جاتے ہیں۔

اب ہم ان تین نکات کی طرف آتے ہیں جن کا ذکر پہلے کیا گیا ہے ـــــ یعنی (۱) اسلام کیا ہے اور مسلمان کسے کہتے ہیں (۲) اسلامی قوانین کیسے مرتب ہو سکتے ہیں اور (۳) اسلامی حکومت کی تشکیل۔ پہلا نکتہ بنیادی ہے اور اسی محور کے گرد ہماری ساری زندگی گردش کرتی ہے۔ قرآن کریم نے اسے چار لفظوں میں متعین طور پر واضح کر دیا ہے جب کہا ہے :-

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)۔

جو لوگ امورِ زندگی کے فیصلے قرآن مجید کے مطابق نہیں کرتے انہیں کافر کہا جاتا ہے۔

بات بالکل صاف ہے۔ زندگی کے معاملات کے متعلق قرآنِ مجید کو سند، حجت اور حرفِ آخر تسلیم کرنا اسلام ہے۔ یوں تو قرآنِ مجید کی متعدد خصوصیات اللہ تعالےٰ نے بیان کی ہیں لیکن ان میں دو تین خصوصیات بنیادی ہیں۔ یعنی

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (۶/۱۱۵)۔

خدا نے جو کچھ دین کے متعلق کہنا تھا اسے اس کتاب میں مکمل کر دیا۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔

قرآن کی اکملیت اور ابدیت اور اس کے ساتھ اس کی محفوظیت (۱۵/۹)۔ اکملیت کے معنے یہ ہیں کہ دین سارے کا سارا اس کے اندر ہے۔ اس سے یہ مکمل ضابطہ حیات قرار پاتا ہے۔ اور غیر متبدل کے معنے یہ ہیں کہ دین کے متعلق جو کچھ اس میں کہا گیا ہے اسے کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ اور محفوظیت کے معنے یہ ہیں کہ یہ قیامت تک غیر محرف اور موجود رہے گا۔ قرآن مجید کی ان ہر سہ خصوصیات کا فطری نتیجہ ختمِ نبوت ہے۔ اقبالؒ کا کلام قرآنِ مجید کی ان خصوصیات کا پیامبر ہے۔ اس کا ملخص ان کے اس ایک شعر میں آ گیا ہے کہ

گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

قرآنی حدود و قیود کی پابندی سے انسان مسلمان قرار پاتا ہے اور ان حدود و قیود میں نہ تغیر و تبدل ہو سکتا ہے نہ حک و اضافہ۔ کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ سب بجا اور درست، لیکن قرآنی احکام و قوانین کی تعبیر میں تو اختلاف ہو سکتا ہے۔ اس کا فیصلہ کون کرے گا؟ اس باب میں پہلے تو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآنِ کریم کا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں (۴/۸۲) دوسرے یہ کہ قرآن اپنی تفسیر آپ کرتا ہے۔ اور تیسرے یہ کہ اختلافی معاملات کا فیصلہ اسلامی مملکت کی مرکزی حکومت کرے گی۔ یہ خود قرآن مجید کا ارشاد ہے۔

دوسرا سوال اسلامی مملکت میں قانون سازی سے متعلق ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ اس نے (بجز چند احکام) اصول اور حدود متعین کر دیئے ہیں اور جزئی و تفصیلی قوانین خود وضع نہیں کئے، اسے اسلامی مملکت پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ ان حدود کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے تفصیلی قوانین خود وضع کرے۔ یہ حدود اور اصول تو ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے لیکن ان کے اندر وضع کردہ قوانین میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق تبدیلی کی جا سکے گی۔ ہمارے ہاں جن قوانین کو اسلامی یا شرعی کہا جاتا ہے وہ درحقیقت کسی زمانے میں اس وقت کی ضروریات کے مطابق وضع کردہ قوانین تھے۔ انہیں دین قرار دینا اور غیر متبدل سمجھنا، انہیں درحقیقت قرآن کا درجہ دے دینا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات تشکیلِ جدید میں اس موضوع پر بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے۔ بہتر ہو کہ اسے آپ ان ہی کے الفاظ میں ملاحظہ کریں۔ وہ کہتے ہیں:-

> اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلی کی روحانی اساس، ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکر دل میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو، اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر (جیسے متضاد عناصر) میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس، اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے

مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دُنیا میں جہاں تغیر کا دَور دورہ ہے، ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرہ میں تغیر کا امکان ہی نہیں ـــــ وہ تغیر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے ـــــ تو اس سے زندگی، جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے، یکسر جامد و متصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی علوم میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس، گزشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ لہٰذا، دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اسلام کی وضع اور ترکیب میں کون سا اصولِ حرکت کارفرما ہے؟ یہ وہی اصول ہے جسے اجتہاد کہتے ہیں۔

اس اصول کی روشنی میں علامہ اقبالؒ نے فقہی قوانین کے متعلق بڑی تفصیلی بحث کی ہے اور کہا ہے کہ یہ قوانین اُس زمانے کی ضروریات پوری کرنے کے لئے تھے جب یہ مرتب کئے گئے تھے۔ خود آئمہ فقہ کا بھی یہ منشا نہیں تھا کہ یہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں:۔

اس لئے اگر دورِ حاضر کے اعتدال پسند مسلمان زمانے کے بدلے ہوئے حالات اور اپنے تجربہ کی روشنی میں فقہ کے اصولِ اساسی کی نئی تعبیرات کرنا چاہتے ہیں تو ان کا یہ طرزِ عمل میرے خیال میں بالکل بجا اور درست ہے۔ خود قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات ایک ترقی پذیر عملِ ارتقاء ہے اس کی مقتضی ہے کہ ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے راہنمائی لے سکتے ہیں۔ لیکن اسلاف کے فیصلے ان کے راستے میں روک نہیں بن سکتے ... اسلام میں اجتہاد کا دروازہ بند کر دینا اسلام کے خلاف افتراء ہے۔

قانون سازی کا یہ تصور پیش کرتے ہوئے انہیں اس کا احساس تھا کہ قدامت پرست طبقہ کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہو گی کیونکہ وہ مروجہ قوانینِ شریعت میں کسی قسم کی تبدیلی جائز نہیں سمجھتے۔ اسی لئے انہوں نے اس بحث کو سمیٹتے ہوئے کہا کہ

وہ سب سے بڑا سوال جو اس وقت مسلم اقوام کے سامنے آنے والا ہے یہ ہے کہ اسلامی قوانینِ شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں۔ یہ سوال بڑا اہم ہے اور بہت بڑی جد وجہد کا متقاضی۔ اس سوال کا جواب یقیناً اثبات میں ہونا چاہیئے بشرطیکہ اسلامی دُنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ

حسبنا کتاب اللہ

ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے

اس موضوع پر علامہ اقبالؒ نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے لیکن ہم سرِدست اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ اس سے واضح ہو

جاتا ہے کہ حضرت علامہ کے نزدیک ہر زمانے کی اسلامی مملکت کو اس کا حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ قرآن کریم کی چاردیواری کے اندر رہتے ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق اپنے قوانین خود وضع کرے۔ ان ہی قوانین کو اُس زمانے کے لئے قوانینِ شریعت کہا جائے گا۔

اب رہا تشکیلِ حکومت کا سوال، سو علامہ اقبالؒ کے ثبات و تغیر کے اصول کی رُو سے اس سوال کا جواب بھی کچھ مشکل نہیں۔ صدرِ اوّل میں جو اسلامی حکومت قائم ہوئی تھی، وہ قرآنی اصولوں کی روشنی میں اس زمانے کے حالات کے مطابق تھی۔ ہمارے زمانے کے حالات اس سے مختلف ہیں۔ لہٰذا، ہم قرآن کے اصولوں کی روشنی میں حکومت کا طریقِ کار خود متعین کر سکتے ہیں۔ اصل سوال قرآن مجید کی اقدار، اصول اور حدود کا ہے، طریقِ کار اور اس کی جزئیات کا نہیں۔ اسلامی حکومت کا اصل، الاصول وہی ہے جسے قرآن نے کفر اور اسلام میں حدِ امتیاز قرار دیا ہے: وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)۔ یعنی اسلامی حکومت اس کی پابند ہوتی ہے کہ وہ ہر معاملہ کا فیصلہ قرآن کے مطابق کرے۔ جہاں تک فیصلہ کرنے کے طریقِ کار کا تعلق ہے اس نے اس کے لئے بھی ایک اصول دیا ہے اور وہ یہ کہ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸)۔ یعنی اس کے فیصلے اُمت کی مشاورت سے ہوں گے۔ اس مشاورت کا طریقِ کار کیا ہوگا اسے قرآن کریم نے خود متعین نہیں کیا۔ اسے ہر زمانے کی اسلامی حکومت کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ مغربی جمہوریت اس لئے غیر اسلامی ہے کہ اس میں فیصلے کرنے کے اختیارات پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاتی۔ اسلامی نظام میں فیصلے کرنے کے اختیارات بلا قیود نہیں ہوتے۔ وہ حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ یہی پابندی اس نظامِ مشاورت کو اسلامی بناتی ہے۔

یہ ہے فکرِ اقبالؒ کی روشنی میں ان (بظاہر) مشکل ترین سوالات کا حل۔ اگر اس کے مطابق عمل شروع ہو جائے تو اس ملک کی تقدیر بدل جائے۔ (طلوعِ اسلام۔ دسمبر ۱۹۷۹ء)

صدرِ مملکت نے کہا تھا کہ ہمیں فکرِ اقبالؒ کی روشنی میں اپنا راستہ متعین کرنا چاہیے، اور طلوعِ اسلام نے اس کی وضاحت کر دی کہ فکرِ اقبال ہمیں یہ راہ نمائی دیتا ہے کہ قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کی چاردیواری کے اندر رہتے ہوئے ہم اپنے لئے آپ قوانین و ضوابط مرتب کریں۔ ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ صدرِ مملکت اس سے متفق ہیں کہ فکرِ اقبالؒ سے ہمیں یہی راہ نمائی ملتی ہے۔ چنانچہ حال ہی میں انہوں نے (INDIA TODAY) کے لئے ایک انٹرویو دیا ہے جو پاکستان کے اخبارات میں شائع ہوا ہے۔ اس میں حسبِ ذیل سوالات اور ان کے جوابات ہمارے موضوعِ زیرِ نظر سے متعلق ہیں:-

سوال: کیا آپ جمہوریت (ڈیماکریسی) میں یقین رکھتے ہیں؟

جواب: ہاں! میں اسلام کی پیش کردہ جمہوریت میں سو فیصد یقین رکھتا ہوں۔ اسلام بہت بڑا جمہوریت پسند (نظامِ حیات) ہے۔ یہ دُنیا کو بہترین نظامِ جمہوریت عطا کرتا ہے۔

سوال: کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ جب بھی اس ملک میں جمہوری نظام کو دوبارہ قائم کرنا چاہیں گے تو آپ کے ذہن میں اس کا وہی نقشہ ہوگا جسے قرآن کریم نے متعین کیا ہے؟

جواب: قرآن مجید نے اس کا کوئی نقشہ متعین نہیں کیا۔ اس میں صرف اصول دیئے گئے ہیں۔ (ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کی) کوئی شکل متعین نہیں کی گئی۔ اس کی شکل و ہیئت (FORMAT) ہمیں خود متعین کرنی ہوگی۔

(پاکستان ٹائمز یکم مارچ سنہ ۱۹۸۰ء)

یہ ہے قرآن کریم اور فکر اقبالؒ کی رو سے، اسلامی مملکت کے لئے آئین و قوانین مرتب کرنے کا طریق۔ ہمارے ہاں اس سلسلہ میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ شریعت بنچ کے زیر سماعت (ریٹائرڈ جسٹس) کیکاؤس کی رِٹ کے سلسلہ میں مہینوں سے یہ بحث چل رہی ہے کہ کسی زمانے کی اسلامی مملکت میں نظامِ حکومت کس قسم کا تھا — الیکشن کیسے ہوتے تھے۔ مجالس قوانین سازی کی ہیئت کس قسم کی تھی۔ ان کا سسٹم پارلیمانی تھا یا صدارتی۔ وغیرہ وغیرہ۔ جیسا کہ ہم متعدد بار کہہ چکے ہیں، اوّل تو، تاریخ کی رُو سے ان امور کا متعین کرنا ہی مشکل ہے اور اگر وہ متعین ہو بھی جائیں تو بھی وہ اُس زمانے کے تقاضوں کو تو پورا کر سکتے تھے، ہمارے زمانے کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکیں گے۔ نہ ہی وہ سسٹم غیر متبدل تھے کہ قیامت تک وہی نافذ العمل رہنے چاہئیں۔ غیر متبدل صرف وہ اصول ہیں جو قرآن کریم میں محفوظ ہیں۔ ان اصولوں کی روشنی میں ہم اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق یہ سسٹم خود وضع کر سکیں گے۔

اسی طرح، اسلامی نظریاتی کونسل نے وضعِ قوانین کے سلسلہ میں جو روش اختیار کر رکھی ہے، وہ بھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔ وہ کسی زمانے میں وضع کردہ فقہی قوانین کو غیر متبدل اسلامی قوانین سمجھ رہی ہے اور انہی کو یہاں نافذ کرنے کے طریقوں پر غور کرتی ہے۔ فقہی قوانین جس زمانے میں وضع ہوئے تھے، اس زمانے کے لئے تو وہ مناسب ہوں گے۔ ہمارے زمانے کے لئے وہ ناموزوں ہیں، نہ ممکن العمل۔ اس کا بین ثبوت وہ چند تعزیری احکام ہیں جنہیں اسلامی حدود کے نام سے سال گزشتہ نافذ کیا گیا تھا۔ سال بھر کے تجربہ نے بتا دیا کہ وہ ناممکن العمل ہیں۔ جس زمانے میں یہ قوانین نافذ کئے جا رہے تھے، ہم نے باصرار و تکرار متنبہ کیا تھا کہ یہ تجربہ ناکام رہے گا۔ اوّل تو اس لئے کہ ازمنہ سابقہ کے مرتب کردہ فقہی قوانین، ہمارے زمانے کے تقاضوں کے مطابق نہیں۔ اور دوسرے اس لئے کہ اسلامی قوانین "اسلامی معاشرہ" میں نتیجہ خیز ہو سکتے ہیں اور ہمارا معاشرہ اسلامی نہیں۔ ہم نے طلوعِ اسلام بابت فروری سنہ ۱۹۷۹ء کے لمعات میں لکھا تھا:-

"ہماری سوچ کا بنیادی نقص یہ ہے کہ ہم مرض کے علاج کے لئے علّتِ مرض (مرض کے بنیادی سبب) کی اصلاح کی طرف توجہ نہیں کرتے، علاماتِ مرض کی سطحی مرہم پٹی کو علاج سمجھ لیتے ہیں۔ اس نکتہ کو ذرا غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جن جرائم کی شرعی سزاؤں کے نفاذ کا پروگرام زیر تجویز ہے۔ (یعنی چوری، زنا، شراب نوشی وغیرہ) مروجہ قوانین کی رو سے بھی وہ جرائم ہیں اور ان کی سزائیں بھی مقرر ہیں۔ اس کے باوجود یہ شکایت عام ہے کہ حقیقی مجرموں کو سزائیں نہیں ملتیں اور بے گناہ پکڑے اور مارے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ یہاں رشوت کا چلن عام ہے۔ اس باب میں پہلے تو پولیس ہی بدنام تھی۔ اب عام عدالتوں کے بارے میں بھی چہ میگوئیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اثباتِ جرم کے لئے جس طرح شہادات وضع کی جاتی ہیں اس کا بھی کسے علم نہیں۔

آپ سوچئے کہ تفتیشی اور عدالتی مشینری تو ویسے کی ویسی رہے اور سزائیں کر دی جائیں زیادہ سخت، تو کیا اس سے جرائم کی اصلاح ہو جائے گی؟ اصلاح تو ایک طرف، اس سے خرابی اور بھی بڑھ جائے گی۔ بات واضح ہے۔

اگر کسی جرم کی سزا (مثلاً) تین ماہ قید ہو تو اس میں رشوت کا "ریٹ" ہزار پانسو سے زیادہ نہیں ہوگا۔ لیکن اگر کسی جرم کی سزا ہاتھ کاٹ دینا یا سنگسار کر دینا ہو تو رشوت کا ریٹ آسمان سے باتیں کرنے لگ جائے گا۔ ملزم اپنا گھر بار بیچ کر بھی رشوت کا مطالبہ پورا کرے گا۔ اس ایک مثال سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ تفتیشی مشینری اور نظامِ عدل کی اصلاح کے بغیر، سزاؤں کی سختی کیا نتائج پیدا کرے گی؟

اصل یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے تعزیری احکام تجویز ہی "اسلامی معاشرہ" کے لئے کئے گئے تھے۔ اسلامی معاشرہ میں کیفیت کیا ہوتی ہے، اس کا اندازہ بھی ایک مثال سے لگا لیجئے۔ اثباتِ جرم کا بنیادی مدار شہادت پر ہوتا ہے۔ اسلامی معاشرہ میں شہادت کے متعلق ارشادِ خداوندی (جس کی تعمیل افرادِ معاشرہ اپنا فریضہ سمجھتے ہیں) ہے۔

يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلَىٰٓ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ إِن يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللّٰهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا ۔ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰٓ أَن تَعْدِلُوا وَإِن تَلْوُوٓا أَوْ تُعْرِضُوا فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ۔ (۴/۱۳۵)

اے اہلِ ایمان! تم ہمیشہ نظامِ عدل کو قائم رکھو۔ اس کی اولین شرط یہ ہے کہ اگر تمہیں کہیں گواہی دینی ہو تو تم نہ مدعی کی طرف سے گواہ بن کر پیش ہو نہ مدعا علیہ کی طرف سے۔ تم خدا کی طرف سے گواہ بن کر جاؤ اور سچی سچی شہادت دو۔ خواہ یہ شہادت خود تمہارے اپنے خلاف ہی کیوں نہ جائے۔ یا تمہارے والدین یا دیگر رشتہ داروں کے خلاف۔ اس باب میں امیر اور غریب میں بھی کوئی فرق نہ کرو (حتیٰ کہ دوست اور دشمن میں بھی نہیں۔ ۵/۸)۔ تم جادۂ حق و صداقت سے ہٹ کر ان کے بہی خواہ مت بنو۔ خدا کو ان کی بہی خواہی کی تم سے زیادہ فکر ہے۔ اس کا بھی خیال رکھو کہ تمہارے جذبات اور میلانات کہیں عمل کی راہ میں حائل نہ ہو جائیں۔ نہ ہی کوئی پیچدار اور ذومعنی بات کہو۔ نہ ہی شہادت دینے سے پہلو تہی کرو۔ یاد رکھو! اللہ کا قانونِ مکافات تمہارے تمام اعمال، جذبات اور رجحانات سے باخبر ہے۔

جہاں تک عدالت کا تعلق ہے، اور تو اور، خدا نے اپنے ایک جلیل القدر رسول سے فرمایا کہ

يٰدَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَن سَبِيلِ اللّٰهِ ۔ (۳۸/۲۶)۔

اے داؤدؑ! ہم نے تمہیں اقتدار اور اختیار عطا فرمایا ہے تو لوگوں کے معاملات میں الحق، (احکامِ خداوندی) کے مطابق عمل کرو اور اپنے جذبات، رجحانات اور خواہشات کا اتباع نہ کرو۔ اگر ایسا کرو گے تو تم خدا کی طرف جانے والے راستے سے گمراہ ہو جاؤ گے۔

اسلامی سزائیں اس معاشرہ کے لئے ہیں جہاں گواہ اس کردار کے حامل ہوں اور جج اس پاکیزگیٔ سیرت کے ہیں۔ اس کے ساتھ معاشرہ کی فضا بھی ایسی ہو جس میں نہ جرائم کے محرکات موجود ہوں اور نہ ہی کسی کو ارتکابِ جرم پہ مجبور کرنے کے اسباب اور مقتضیات۔ اس قسم کی بلندیٔ کردار اور پاکیزگیٔ سیرت اس پروگرام سے پیدا ہوتے ہیں جسے قرآنِ کریم نے نفسیاتی تبدیلی سے تعبیر کیا ہے۔ اس تبدیلی کے بغیر، جرائم کا سدِ باب تو ایک طرف، عادات و اطوار

میں بھی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی "

اُس وقت تو ہماری کسی نے نہ سُنی (کون سُنتا ہے فغانِ درویش ؟) لیکن اب اور تو اور خود صدرِ مملکت بھی گلہ سنج ہیں کہ ان قوانین کے کوئی بہتر نتائج برآمد نہیں ہوئے۔ انہوں نے، بلدیاتی کنونشن (منعقدہ اسلام آباد) سے خطاب کرتے ہوئے جو کچھ کہا وہ (نوائے وقت بابت ۷، مارچ ۱۹۸۸ء میں) ان الفاظ میں شائع ہوا ہے :-

صدر جنرل ضیاء الحق نے آج شام بلدیاتی کنونشن سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا ہے کہ اگر اسلامی حدود کے نفاذ کے سلسلہ میں جلد بہتر نتائج برآمد نہ ہوئے تو کوئی متبادل راستہ اختیار کیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے بتایا کہ یا تو موجودہ نظامِ عدل میں کوئی ترمیم کی جائے گی اور یا کوئی دوسرا راستہ اختیار کیا جائے گا۔ صدر نے کہا کہ اسلامی حدود کے نفاذ کو ایک سال ہو رہا ہے اور اب قوم مجھ سے پوچھنے میں حق بجانب ہے کہ اس ایک سال کے عرصہ میں ان حدود کے کیا نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ اسلامی حدود کے قوانین وضع کرتے وقت عدلیہ سے بات کی گئی تھی۔ اس وقت دو تجاویز سامنے آئی تھیں۔ اوّل یہ کہ یا تو ان حدود پر عملدرآمد کے لئے علماء کی عدالتیں قائم کر دی جائیں یا پھر یہ حدود موجودہ نظامِ عدل کے سپرد کر دی جائیں۔ عدلیہ کی طرف سے یہ کہا گیا کہ کام کو ان کے سپرد کر دیا جائے۔ انہوں نے یقین دلایا تھا کہ وہ اس کام کو احسن طریق سے کریں گے۔ ہم نے ان کی سفارش پر یہ کام ان کے سپرد کر دیا۔ مگر طریقِ کار میں کچھ مشکلات رہیں۔ صدر نے کہا کہ اب ایک سال گزرنے پر لوگ ان حدود کے نتائج معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اگر اس کے جلد بہتر نتائج نہ نکلے تو متبادل حل تلاش کیا جائے گا۔

ہم صدرِ مملکت کی خدمت میں بصد ادب گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ طریقِ کار میں بھی خرابی ہو گی اور عدلیہ نظام میں بھی نقص، لیکن اگر یہ قوانین خاطر خواہ نتائج مرتب نہیں کر سکے تو اس کی بنیادی وجہ نہ تو طریقِ کار کی کوئی خرابی ہے اور نہ ہی عدلیہ کے نظام کا نقص۔ یہ نقص خود ان قوانین کے اندر ہے۔ اگر کوئی متبادل طریقِ کار اختیار بھی کر لیا جائے تو بھی ان کے مطلوبہ نتائج برآمد نہیں ہو سکیں گے۔ اوّل تو یہ قوانین اسلامی کہلا ہی نہیں سکتے۔ اسلامی قوانین وہ ہوں گے جنہیں اس اصول کے مطابق جس کا ذکر صدرِ مملکت نے اپنے مذکورہ صدر سانٹر ویو میں کیا ہے، ملتِ اسلامیہ خود مرتب کرے گی۔ یعنی قرآن مجید کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، زمانہ حاضرہ کے تقاضوں کے مطابق قوانین ـــ اور دوسرے یہ کہ اسلامی قوانین، اسلامی معاشرہ میں نافذ العمل ہو سکیں گے۔ ہمارے موجودہ معاشرہ میں نہیں جس کے کسی گوشے میں بھی اسلام کی جھلک نظر نہیں آتی۔ ہماری بنیادی غلط فہمی یہ ہے کہ ہم قوانین اور نظام کو خلط ملط کر دیتے ہیں۔ ہم نے پہلے تو اپنے ہاں نافذ کردہ تعزیری قوانین (حدود) کو اسلامی کہہ کر پکارا اور پھر انہی کے نفاذ کو اسلامی نظام سے تعبیر کر دیا۔ صدرِ مملکت نے اپنے اس خطاب میں جس کا ایک اقتباس اوپر دیا گیا ہے، تعزیراتی قوانین کی ناکامی کے حوالہ سے بات کرتے ہوئے

کونسلروں پر زور دیا کہ وہ اپنے حلقہ اثر کے اندر اسلامی نظام پر مؤثر عمل کرائیں۔ اس لئے کہ پاکستان کے تحفظ کا ایک ہی راستہ اسلام ہے۔ انہوں نے بتایا کہ نظامِ اسلام کے عمل کو بہتر اور مؤثر بنانے کے لئے

کئی قوانین کا اعلان کیا جا چکا ہے اور مزید کام ہو رہا ہے۔ زکوٰۃ اور عشر پر کام ہو رہا ہے۔ کئی علاقوں میں لوگوں نے اپنے طور پر بیت المال قائم کر دیئے ہیں اور کئی لوگ اس پر کام کر رہے ہیں۔ اس وقت اسلامی نظام کے لئے فضا بہت سازگار ہے اس لئے کام تیز کر دیں۔ (ایضاً)

قوانین اور اسلامی نظام کو مرادف قرار دینے سے اسلام کو جو نقصان پہنچے گا اس کا اندازہ صدرِ مملکت کے خطاب کے ہر دو اقتباسات کو سامنے رکھنے سے بخوبی لگ سکے گا۔ صدرِ مملکت نے پہلے فرمایا ہے کہ اسلامی قوانین کو نافذ ہوئے ایک سال کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن وہ اپنی نتیجہ خیزی میں ناکام رہے ہیں۔ اور اس کے بعد انہوں نے انہی قوانین کو اسلامی نظام سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہاں اسلامی نظام کو نافذ ہوئے ایک سال کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن اس سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اس سے دُنیا، اس کے سوا کس نتیجہ پر پہنچے گی کہ اسلامی نظام میں اب اس کی صلاحیت ہی نہیں رہی کہ وہ خاطر خواہ نتائج مرتب کر سکے۔ یہ وہ نقصان تھا جس کی طرف ہم نے فروری ۱۹۷۹ء میں ان الفاظ میں اشارہ کیا تھا۔ ہم نے لکھا تھا:-

"اسلامی نظام کا آغاز سزاؤں سے کرنے کا ایک نقصان تو وہ ہوگا جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ یعنی اس سے رشوتوں کے دروازے وسیع ہو جائیں گے لیکن اس سے بھی زیادہ نقصان ایک اور ہوگا۔ ہم نے صدیوں کے بعد اسلامی نظام کے احیاء کا دعویٰ، اور اس کے انسانیت ساز نتائج کا فردوس بداماں منظر دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس وقت ساری دُنیا کی نگاہیں، اس منظر کو دیکھنے کے لئے ہماری طرف لگ رہی ہیں۔ اگر زیرِ نظر تجربہ ناکام رہا، تو دُنیا ہمارے متعلق جو کہے گی سو کہے گی۔ وہ اسلام کے متعلق اپنے اس خیال میں پختہ ہو جائے گی کہ یہ ایک چلا ہوا کارتوس ہے جو زمانے کے بدلے ہوئے حالات کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اور ان کے اس پراپیگنڈہ سے خود ہمارے ہاں کا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ متاثر ہو کر اسلام کی طرف سے بددل ہو جائے گا۔ اور اس کی یہ بددلی خود پاکستان کے مستقبل کو بُری طرح مجروح کر دے گی۔ یہ ایسا نقصان ہوگا جس کی تلافی نہیں ہو سکے گی۔"

ہم نے پاکستان میں اسلام۔ اسلامی قوانین۔ اسلامی نظام۔ نظامِ مصطفیٰؐ وغیرہ الفاظ دھڑا دھڑ اکر دنیا کے اس تاثر کو پختہ تر کر دیا ہے کہ اسلام عہدِ پارینہ کی داستان ہے۔ اب یہ فرسودہ ہو چکا ہے۔ یہ تاثر اسی صورت میں زائل ہو سکے گا کہ ہم اس حقیقت کا اعتراف اور اعلان کریں کہ اس وقت مسلمانوں کے کسی ملک میں بھی اسلامی نظام نافذ نہیں۔ اسلامی نظام کا اوّلیں نتیجہ افرادِ معاشرہ کی سیرت کی پاکیزگی اور اخلاق کی بلندی ہوتا ہے، اور اس کی محسوس پہچان یہ کہ اس میں کوئی فرد رات کو بھوکا نہیں سوتا۔ یہی ارشادِ خداوندی ہے اور یہی پیغامِ مصطفویؐ۔

صدرِ مملکت نے اپنے (INDIA TODAY) کے انٹرویو میں، ایک سوال کے جواب میں یہ بھی فرمایا کہ اسلام میں پولیٹیکل پارٹیز (سیاسی جماعتوں) کا تصور ہی نہیں۔ جو چیز بھی دو مسلمانوں میں اختلاف اور افتراق (RIFT) پیدا کرنے کا موجب ہو وہ غیر اسلامی ہے۔ اور سیاسی جماعت کا پہلا اصول اختلاف اور افتراق پیدا کرنا ہوتا ہے۔ ورنہ وہ کامیاب نہیں ہو سکتی۔

(پاکستان ٹائمز۔ یکم مارچ ۱۹۸۰ء)

صدرِ مملکت نے بالکل بجا فرمایا ہے کہ جو چیز بھی مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کا موجب ہو وہ خلافِ اسلام ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ سیاسی جماعتیں بھی اُمت میں تفرقہ پیدا کرنے کا موجب ہوتی ہیں۔ اس لئے ان کا وجود خلافِ اسلام ہے۔ لیکن سیاسی جماعتوں سے کہیں زیادہ تفرقہ کا موجب مذہبی فرقے ہیں۔ اس لئے ان کا وجود بھی غیر اسلامی ہے۔ سیاسی جماعتیں تو بنتی ہیں، بگڑتی ہیں۔ اُبھرتی ہیں، مٹتی ہیں۔ انہیں (BAN) بھی کیا جا سکتا ہے۔ کالعدم بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن مذہبی فرقے اپنا مستقل وجود رکھتے ہیں اور اُمت میں تفرقہ ہی نہیں، شدید نفرت اور عداوت پیدا کرنے اور برقرار رکھنے کا موجب ہیں۔ انہیں نہ مٹایا جا سکتا ہے نہ (BAN) کیا جا سکتا۔ سیاسی جماعتوں کا پیدا کردہ تفرقہ عارضی اور تغیر پذیر ہوتا ہے لیکن مذہبی فرقوں کا پیدا کردہ تفرقہ مستقل اور غیر متبدل ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جس معاشرہ میں تفرقہ انگیزی کی ایسی شدید (اور غیر اسلامی) علت موجود ہو، اس میں اسلامی نظام کس طرح قائم ہو سکتا ہے؟ قرآن کریم نے تو بہ نصِ صریح فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے (۳۰/۳۱-۳۲)۔ اس لئے اُمت میں وحدت پیدا اور اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے سیاسی پارٹیوں اور مذہبی فرقے دونوں کو مٹانا ضروری ہے۔ اگر یہ کہہ دیا جائے کہ مذہبی فرقے تو مٹائے نہیں جا سکتے تو پھر اس کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ بحالاتِ موجودہ اسلامی نظام قائم نہیں کیا جا سکتا۔

***

"اسلامی قوانین" کا ذکر چھڑا تو پاکستان کی عدالتِ عالیہ (سپریم کورٹ) کے چیف جج محترم جسٹس ایس انوار الحق کا ایک ارشاد سامنے آگیا۔ انہوں نے اگلے دنوں قانون دان طبقہ سے خطاب کرتے ہوئے انہیں تلقین کی کہ

> وہ اسلامک لاء (اسلامی قانون) اور فقہ میں خصوصی مہارت حاصل کریں تاکہ وہ ملک کی اعلیٰ عدالتوں کی، ان کے مطابق مقدمات کے فیصلہ کرنے کے سلسلہ میں، معاونت کر سکیں۔ (انہوں نے فرمایا کہ) شریعت بنچوں کے دائرہ اقتدار کی توسیع اور قوانین کے بتدریج "اسلامی" بنائے جانے (ISLAMISATION) کی وجہ سے، مسلم لاء کے خصوصی ماہرین کی بڑی تعداد میں ضرورت پڑے گی۔
>
> (پاکستان ٹائمز۔ ۷ر مارچ سنہ ۱۹۸۰ء)

معلوم نہیں، ملکی قوانین کو "اسلامی" بنانے (ISLAMISATION) سے محترم چیف جسٹس کی مراد کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس سے مراد وہی طریق ہو سکتا ہے جس کی رو سے اسلامی نظریاتی کونسل، اسلامی قوانین مرتب کر رہی ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو ان قوانین کی قسطِ اوّل کا تجربہ تو خود ان کا نظامِ عدل گزشتہ ایک سال میں کر چکا ہے۔ ہم موصوف سے بصد احترام دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا ان کے نزدیک جرمِ زنا کے ارتکاب کے ثبوت میں چار عینی گواہوں کی شہادت ممکن العمل؟ اور جرم کی سزا سنگساری، اسلام کے مطابق ہے؟ کیا اسی کا نام (ISLAMISATION) ہے۔

***

ضروری تصحیح

طلوعِ اسلام بابت اپریل سنہ ۱۹۷۹ء۔ صفحہ ۵۴۔ سطر ۹ (مقالہ فقہی قوانین کی دینی حیثیت)

یہ سُن کر آپ کو شاید حیرت ہو کہ اس کی مخالفت امامِ اعظمؒ نے کی تھی۔

"امامِ اعظم" کی جگہ "ائمہ فقہ حنفی" پڑھیئے۔

اس مقالہ کا پمفلٹ بھی شائع کیا گیا تھا۔ مندرجہ بالا عبارت اس پمفلٹ کے صفحہ ۱۴ سطر ۹ پر ہے۔

حقائق و عبر

ولایت سے آمدہ مبلّغِ اسلام

ہمارے ہاں آج کل اخبارات میں ایک بزرگوار کا تذکرہ ہو رہا ہے جو تبلیغِ اسلام کے لئے پیرس سے تشریف لائے ہیں۔ ان کا اسمِ گرامی ہے ڈاکٹر محمد حمید اللہ (پی۔ ایچ۔ ڈی) آپ حیدرآباد (دکن) میں (غالباً) پروفیسر تھے۔ اس ریاست پر جب بھارت نے قبضہ جمالیا تو آپ کچھ عرصہ کے لئے پاکستان آ گئے اور یہاں سے پیرس چلے گئے۔ وہیں سے اب وہ تبلیغِ اسلام کے لئے دوبارہ پاکستان آئے ہیں۔ ان کے دو لیکچر بہاولپور میں ہو چکے ہیں جن کی رپورٹ پاکستان ٹائمز مورخہ ۳/۱۱ میں شائع ہوئی ہے لیکن یہ رپورٹ ایک خبرنامہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں لیکچرز کے متعلق تفصیل سے کچھ نہیں کہا گیا اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے قوم کے نوجوانوں کے سامنے اسلام اور اسلامی مملکت کے کس قسم کے تصورات پیش فرمائے ہیں۔ اسلامی مملکت ہم نے خاص طور پر اس لئے کہا ہے کہ تقسیمِ ہند سے پہلے ان کی ایک کتاب شائع ہوئی تھی جس کا نام تھا:۔

(THE MUSLIM CONDUCT OF STATE)

اس سے ہمارا خیال اس طرف گیا کہ انہوں نے اسلامی مملکت کے تصورات ضرور نمایاں کئے ہوں گے۔ جس زمانے میں ڈاکٹر صاحب یہاں تھے، ان کے مضامین اکثر شائع ہوتے رہتے تھے، بالخصوص، کراچی سے شائع ہونے والے انگریزی جریدہ "الاسلام" میں۔ ہم نے اس زمانے میں ان مقالات کے کچھ اقتباسات اپنے ہاں شائع کئے تھے۔ ہم بغرضِ تعارف ان میں سے دو ایک درج ذیل کرتے ہیں۔ ایک مضمون میں انہوں نے حج کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے لکھا تھا:۔

> جنّت سے نکلنے کے بعد (حضرت) آدم اور (اماں) حوا ایک دوسرے سے بچھڑ گئے تھے۔ وہ مدتوں ایک دوسرے کو تلاش کرتے رہے اور بالآخر خدا کی رحمت سے عرفات کے میدان میں ان کی ملاقات ہو گئی۔ خدا کے اس احسان کے شکریہ کے لئے آدم و حوا کی اولاد خدا کی طرف رجوع کرتی ہے اور کوشش کرتی ہے کہ اپنے آپ کو بھلا کر بحضور باری تعالٰے جذب ہو جائیں اور خدا سے اپنی سابقہ لغزشوں کی معافی مانگیں اور آئندہ کے لئے اس کی تائید و نصرت کی التجا کریں۔ (الاسلام، بابت یکم جولائی ۱۹۵۹ء)

یہ تو ہوا حج کا فلسفہ! وہاں "تین شیطانوں" کو جو پتھر مارے جاتے ہیں، ان کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے لکھا تھا:۔

> حضرت ابراہیمؑ نے یہ دعوے کیا کہ انہیں خدا کی محبت ہر شئے سے بڑھ کر ہے تو اس کے ثبوت میں خدا نے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے بیٹے کو قربان کر دے۔ یہی آزمائش کچھ کم نہ تھی۔ اس پر طرّہ یہ کہ شیطان تین مرتبہ حضرت ابراہیمؑ کے پاس پہنچا تاکہ انہیں اس قربانی سے باز رکھے ـــ کہتے ہیں کہ یہ واقعہ منیٰ میں ہوا تھا۔ لیکن حضرت ابراہیمؑ نے ہر مرتبہ شیطان کو پتھر مار کر بھگا دیا۔ لہٰذا ہر حاجی سنّتِ ابراہیمی

کے اتباع میں استعاذۃً شیطان کو پتھر مارتا ہے کہ وہ اس کے وساوس سے محفوظ رہے (ایضاً)

قرآن کے متعلق

اُس زمانے میں ڈاکٹر صاحب نے ..... قرآنِ مجید کی جمع اور ترتیب کے سلسلہ میں ایک مقالہ شائع فرمایا تھا۔ اس میں آپ نے لکھا تھا:۔

یہ معلوم ہے کہ نبی اکرمؐ بعض اوقات قرآن کی ان آیات کو منسوخ فرما دیتے تھے جو اس سے پہلے لوگوں تک پہنچائی گئی تھیں۔ یہ کچھ جدید وحی کی بناء پر کیا جاتا تھا۔ ایسے صحابہؓ بھی تھے جنہوں نے پہلی آیات کو یاد کر رکھا ہوتا۔ لیکن انہیں بعد میں نازل شدہ آیات کا علم نہ ہوتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یا تو وہ آیاتِ مابعد کے نزول سے پہلے انتقال فرما گئے تھے یا مدینہ سے باہر کسی اور مقام میں سکونت پذیر ہو چکے تھے یہ ہو سکتا ہے کہ ان صحابہؓ نے قرآن کے ایسے نسخے چھوڑے ہوں جو اگرچہ مستند تھے لیکن (OUTDATED) ہو چکے تھے .... علاوہ ازیں عرب کے مختلف علاقوں کی بولی میں فرق تھا۔ نبی اکرمؐ نے ان علاقوں کے لوگوں کو اجازت دے رکھی تھی کہ وہ قرآن کو اپنے اپنے لہجہ کے مطابق پڑھ لیا کریں۔ نہ صرف یہ بلکہ انہیں اس کی بھی اجازت دے دی تھی کہ اگر وہ قرآن میں کوئی ایسا لفظ دیکھیں جس کا انہیں علم نہ ہو تو وہ اس لفظ کو اپنی زبان کے ایسے لفظوں سے بدل لیا کریں جسے وہ اچھی طرح جانتے ہوں۔

(الاسلام ۔ ۱۵ دسمبر ۱۹۸۵ء)

ہم نے اس زمانے میں اس پر جو تبصرہ کیا تھا اسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔

احادیث کے متعلق

احادیث کے متعلق یہ سوال بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ اگر یہ وحی پر مشتمل دین کا ابدی حصہ تھیں تو حضورؐ نے ان کا ایک مستند مجموعہ خود مرتب کر کے اُمّت کو کیوں نہ دے دیا۔ سود مودودی (مرحوم) نے اس کا یہ جواب دیا تھا کہ

اُس وقت لکھنے پڑھنے والے کم تھے اور سامانِ کتابت اور بھی زیادہ کمیاب تھا۔

(ترجمان القرآن۔ مارچ ۱۹۵۶ء)

اور اس سوال کے جواب میں کہ اگر احادیث بھی وحی تھیں تو انہیں قرآن کے اندر شامل کیوں نہ کر لیا گیا، انہوں نے فرمایا تھا کہ

اس سے قرآن مجید کم از کم انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے برابر ضخیم ہو جاتا۔ (تفہیمات۔ حصہ اوّل۔ صفحہ ۲۳۶)

لیکن ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اس کی وجہ اور بتائی تھی۔ انہوں نے لکھا تھا:۔

نبی اکرمؐ بحیثیت انسان اپنے افعال میں محتاط اور (MODEST) تھے۔ بحیثیت رسولِ خدا انہوں نے اس امر کے لئے ہر ممکن اور ضروری اقدامات کر لئے تھے کہ خدا کا پیغام، یعنی قرآن نہ صرف لوگوں تک پہنچا دیا جائے بلکہ اسے محفوظ بھی کر دیا جائے۔ اگر وہ اپنے قول کی حفاظت کے لئے بھی اسی قسم کے اقدامات کرتے تو بعض لوگ انہیں (EGOIST) خیال کرتے۔ (یعنی اسے حضورؐ کی انانیت

پر محمول کرتے) - اس وجہ سے حدیث کی کہانی قرآن سے مختلف ہے -

(الاسلام - مؤرخہ یکم و پندرہ جنوری سنہ ۱۹۵۹ء)

حدیث کی اہمیت کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ہے :-

اگر کوئی شخص حدیث کو نہیں مانتا تو اسے اسلام سے انکار تصور کیا جائے گا۔

(پاکستان ٹائمز - مؤرخہ ۱۱ر مارچ سنہ ۱۹۸۶ء)

ہم اس ضمن میں محترم ڈاکٹر صاحب سے صرف ایک سوال پوچھنا چاہتے ہیں - بخاری شریف، کتاب اجتہاد میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا :-

سلیمان بن داؤد (علیہما اسلام) نے ایک روز کہا کہ آج شب میں سو عورتوں کے پاس یا ننانویں عورتوں کے پاس جاؤں گا - وہ سب عورتیں ایک ایک شاہسوار پیدا کریں گی جو خدا کی راہ میں جہاد کرے گا، تو ان سے ان کے ایک ہم نشین نے کہا کہ انشاء اللہ کہو - مگر انہوں نے انشاء اللہ نہیں کہا - پس ان میں سے صرف ایک عورت حاملہ ہوئی، سو وہ بھی آدھا بچہ جنی - قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے کہ اگر وہ انشاء اللہ کہہ لیتے تو (سب عورتوں کے بچے پیدا ہوتے اور) بیشک وہ سب سوار ہو کر اللہ کی راہ میں جہاد کرتے -
(عربی بخاری مطبوعہ مصر - اردو ترجمہ شائع کردہ نور محمدؐ - جلد دوم - صفحہ ۳)

ہم محترم ڈاکٹر صاحب سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا وہ اس حدیث کو صحیح مانتے ہیں؟ اور اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اس حدیث کی نسبت رسول اللہ کی طرف صحیح نہیں تو اس کے متعلق آپ کا کیا ارشاد ہوگا - واضح رہے کہ یہ کہنا کہ فلاں روایت کی حضورؐ کی طرف نسبت صحیح نہیں تو اسے حدیث کا نہ ماننا نہیں کہا جائے گا - کہا یہ جائے گا کہ اسے حضورؐ کی طرف غلطی سے منسوب کر دیا گیا ہے -

سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) نے اس فرق کو نمایاں طور پر واضح کیا ہے - وہ لکھتے ہیں :-

قولِ رسولؐ اور وہ روایات جو حدیث کی کتابوں میں ملتی ہیں لازماً ایک چیز نہیں - اور نہ ان روایات کو استناد کے لحاظ سے آیاتِ قرآنی کا ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے - آیاتِ قرآنی کے منزل من اللہ ہونے میں تو کسی شک کی گنجائش ہی نہیں - بخلاف اس کے روایات میں اس شک کی گنجائش موجود ہے کہ جس قول یا فعل کو نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ واقعی حضورؐ کا ہے یا نہیں! (رسائل و مسائل حصہ اوّل - صفحہ ۲۷)

۲۔ عقل و فکر سے کام لینا حرام ہے

بخاری شریف کی ایک حدیث ہے جس کا اُردو ترجمہ حسبِ ذیل ہے :-

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا :-

جہنم کی آگ نے اپنے رب کی جناب میں شکایت کرتے ہوئے عرض کیا! اے میرے رب! میرا بعض حصہ میرے بعض حصے کو کھا رہا ہے - تب اللہ تعالیٰ نے اسے دو سانس لینے کی اجازت مرحمت فرمائی

ایک سانس سردیوں میں اور ایک سانس گرمیوں میں۔ اب جو تم سردیوں میں سخت سردی پاتے ہو اس کی وجہ یہی ہے۔

جن دلوں میں ناموسِ رسالتؐ کا احترام ہے وہ بلا تامل کہہ دیں گے کہ اس قسم کی روایات کبھی حضور نبی اکرمؐ کے ارشادات نہیں ہو سکتے۔ وہ ذاتِ گرامیؐ جو دانشِ نورانی اور دانشِ برہانی کے معراج کبریٰ پہ فائز تھی کبھی اس قسم کی خلافِ فطرت اور خلافِ مشاہدہ بات نہیں کہہ سکتی تھی۔ چنانچہ طلوعِ اسلام نے بھی اسی بنا پر اس روایت پہ اعتراض کیا تھا اور کہا تھا کہ یہ وضعی ہے۔ کراچی سے شائع ہونے والے جریدہ "صحیفہ اہلِ حدیث" نے اس روایت کو صحیح قرار دیتے ہوئے تفصیلی شذرہ لکھا ہے جسے لاہور کے ہفتہ وار جریدہ الاعتصام نے اپنی اشاعت بابت ۷ مارچ ۱۹۸۰ء میں دہرایا ہے۔ ہم اسے درجِ ذیل کرتے ہیں تاکہ ان حضرات کا موقف قارئینِ طلوعِ اسلام کے سامنے بھی آجائے۔ اس میں لکھا ہے:۔

——— (اس پر اعتراض یہ کیا جاتا ہے) کہ مشاہدہ یہ بتلاتا ہے کہ موسموں یعنی گرمی و سردی کی تبدیلی سورج کی وجہ سے ہوتی ہے وہ جب بعض ممالک کے خطِ استواء پر پہنچتا ہے تو وہاں گرمی پڑتی ہے اور اس کی عمودی صورت میں جب کہ وہ زمین سے دور ہو جاتا ہے، سردی پڑتی ہے۔ اور یہ حدیث بتا رہی ہے کہ جہنم باہر کی طرف سانس لیتی ہے تو گرمی پڑتی ہے اور اندر کی طرف سانس لیتی ہے تو سردی پڑتی ہے۔ اگر یہی بات ہوتی تو پوری دنیا میں بیک وقت گرمی پڑتی اور پوری دنیا میں بیک وقت سردی پڑتی، حالانکہ ظاہر ایسا نہیں ہے بلکہ جس وقت دنیا کے ایک خطہ میں گرمی پڑ رہی ہوتی ہے تو اس کے بہت سے علاقے ایسے ہوتے ہیں جہاں سردی پڑ رہی ہوتی ہے یا پھر موسم خوشگوار ہوتا ہے۔ یا پھر دنیا کے کئی ایک علاقے ایسے ہیں جو کہ گرمی کے نام سے اور بعض علاقے ایسے ہیں جو کہ سردی کے نام سے ناآشنا ہیں۔ جب کہ دنیا کے موسم کی یہ حالت ہے تو پھر حدیث کا یہ کہنا کہ گرمی اور سردی جہنم کے سانس کی وجہ سے پڑتی ہے کہاں تک درست ہے؟ اس کے جواب میں سب سے پہلی گزارش یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وہ بندے جنہوں نے صدقِ دل سے کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھا ہے وہ اس قسم کی کٹ حجتی نہیں جانتے وہ تو خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر ہر فرمان پہ بلا چون و چرا ایمان لاتے۔ انہیں تسلیم کرنے اور ان میں اپنی عقل لڑانے کو حرام سمجھتے ہیں۔ چنانچہ آج تک کے سلفِ صالحین، محدثین، مفسرین اور شارحین میں سے کسی ایک نے بھی اس حدیثِ نبویؐ پہ کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ وہ اسے من و عن مانتے چلے آئے۔ بعد والوں کا بھی یہی فرض تھا کہ وہ اس میں اپنے عقلی گھوڑے دوڑانے کی بجائے آمنا و صدقنا کہتے ہیں خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں میں اپنی عقل کو داخل کرنا ایک مسلمان کی شان کے منافی ہے۔

اس روایت پہ تنقید کرنے والے نہ تو خدا کے کسی فرمان پہ تنقید کرتے ہیں اور نہ ہی حضور نبی اکرمؐ کے کسی ارشادِ گرامی پہ۔ فرامینِ خداوندی قرآن مجید کے اندر محفوظ ہیں اور یہ ہدایت ان میں شامل نہیں۔ اس لئے اس پہ تنقید خدا کے کسی فرمان

پرچہ نہ ملنے کی اطلاع ۱۵ تاریخ سے پہلے دیں اور خریداری نمبر اور پتہ صاف اور خوشخط لکھ کر بھیجیں۔

کے خلاف تنقید نہیں قرار دی جاسکتی۔ نہ ہی اسے ارشادِ رسالتمآبؐ قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ احادیث کو اقوالِ رسول اللہؐ نہیں کہا جاتا، اقوال منسوب الی الرسول کہا جاتا ہے اور اس قسم کی روایات کے متعلق طلوعِ اسلام کہتا یہ ہے کہ رسول اللہؐ کی طرف ان کی نسبت صحیح نہیں۔ لہٰذا، اس روایت پہ تنقید، رسول اللہؐ کے کسی ارشادِ گرامی پہ تنقید نہیں بلکہ تنقید کرنے والوں کا کہنا یہ ہے کہ اس قسم کی روایت رسول اللہؐ کا ارشاد ہو نہیں سکتی۔ اسے حضورؐ کی طرف غلط منسوب کیا گیا ہے۔

ایک مدت کے انتظار کے بعد عصرِ حاضر کی نہایت اہم تصنیف

نظامِ ربوبیت (شائع ہو گئی)

(یہ پہلے ایڈیشن سے کہیں مختلف ہے)

آپ ایک عرصے سے سنتے چلے آرہے ہیں کہ اسلام، نہ نظامِ سرمایہ داری کا حامی ہے، نہ کمیونزم کا۔ اس کا اپنا منفرد معاشی نظام ہے جس میں نوعِ انسان کی مشکلات کا حل مضمر ہے۔ لیکن کسی نے یہ نہ بتایا کہ اسلام کا وہ معاشی نظام ہے کیا؟

مفکرِ قرآن، پرویز صاحب کی اس تصنیف میں نہایت وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ:-

(۱) نظامِ سرمایہ داری کیا ہے؟ کمیونزم اور سوشلزم کے نظام کیا ہیں۔ اور یہ کیوں ناکام رہ گئے ہیں۔

ان کے برعکس

(۲) اسلام کا وہ معاشی نظام کیا ہے جو نوعِ انسان کی مشکلات کا اطمینان بخش حل پیش کرتا ہے۔ اس کی روشنی میں یہ بھی بتایا گیا ہے:-

- مارکس نے کس طرح یہ اعتراف کیا کہ اس کا نظام ناقابلِ عمل ہے۔
- ماؤزے تنگ کا فلسفۂ اضداد کی بنیادیں کس طرح نااستوار ہیں۔
- ربوٰا (سود) کا مسئلہ کیا ہے اور اس کا حل کیا ہے۔
- زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم کیا ہے۔

اس کتاب کے بعد آپ کو معاشیات کے موضوع پہ کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں رہے گی۔

کتاب، آفسٹ کی چھپائی میں، ولایتی سفید کاغذ پر طبع ہوئی ہے۔ ضخامت سوا چار سو صفحات ——— سنہری جلد

قیمت فی جلد پچاس روپے ۵۰/- ——— (علاوہ محصول ڈاک)

ملنے کا پتہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور ● مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

بتقریب یومِ پاکستان

ہم نے پاکستان کیوں مانگا تھا؟

(پرویز)

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو اقبال پارک لاہور (جسے اس زمانے میں منٹو پارک کہتے تھے) غیر منقسم ہندوستان کے مسلمانوں کے اجتماعِ عظیم میں انتہائی جوش و خروش اور جذب و خلوص کے ساتھ، وہ رزولیوشن پاس ہوا جسے "قراردادِ پاکستان" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس میں مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ، آزاد مملکت کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اُس زمانے میں ہر ایک کو معلوم تھا کہ اس مملکت کا مطالبہ کیوں کیا گیا ہے اور اس کی غرض و غایت کیا ہے کیونکہ اس کا مطالبہ کرنے والوں (علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ) نے اس کی اس طرح وضاحت کر دی تھی کہ اس میں نہ کسی شک و شبہ کی گنجائش تھی اور نہ ہی کسی التباس و ابہام کا امکان۔ لیکن (جائے صد حیرت ہے کہ) حصولِ پاکستان کے بعد اس مملکت کی غرض و غایت اور اس کا مطلوب و مقصود (یا نصب العین) آہستہ آہستہ نگاہوں سے اوجھل ہوتا چلا گیا۔ جن لوگوں نے اس مطالبہ کی تحریک میں حصہ لیا تھا یا جو اس کے عینی شاہد تھے، رفتہ رفتہ وہ بھی دنیا سے چلے گئے، ——— اور باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ہماری نئی نسل (یا یوں کہئے کہ موجودہ قوم) کے ذہن سے اس کا تصور ہی محو ہو چکا ہے۔ حتیٰ کہ ان میں سے بعض کو یہ کچھ کہتے بھی سُنا گیا ہے کہ تقسیمِ ہند کا فائدہ کیا تھا اور ہم نے الگ مملکت بنا کر حاصل کیا کیا؟ اس میں شبہ نہیں کہ اس قسم کے وساوس کے عام کرنے میں پاکستان دشمن عناصر کی سازش بھی کارفرما ہوتی ہے لیکن ہمارا نوجوان طبقہ ان سے متاثر اس لئے ہو جاتا ہے کہ اس قسم کے اعتراضات کا مناسب جواب اس کے پاس نہیں ہوتا۔

طلوعِ اسلام نے اپنا فریضہ قرار دیا کہ وہ اس مملکت کی تشکیل کی غرض و غایت کی عام نشر و اشاعت کرتا رہے۔ چنانچہ وہ گزشتہ تیس بتیس سال سے اس فریضہ کو مسلسل ادا کئے چلا آ رہا ہے۔ چونکہ پاکستان کی غرض و غایت متعین تھی اس لئے ظاہر ہے کہ جب اسے بار بار سامنے لایا جائے گا تو اس میں تکرار لازمی ہوگی۔ چنانچہ قارئینِ طلوعِ اسلام کا وہ طبقہ جو شروع سے اس کے ساتھ وابستہ چلا آ رہا ہے بعض اوقات اس تکرار کو خوشگوار آمد نہیں قرار دیتا لیکن اس کے باوجود ہم اس کی بار بار نشر و اشاعت کو نہایت ضروری سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ قوم کی مثال تو ایک جوئے رواں کی سی ہوتی ہے جس میں ہر آن نیا پانی سامنے آتا ہے۔ یعنی قوم کے پرانے افراد آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں اور نئے افراد ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ قوم کے یہ نئے افراد ہیں جو پاکستان کی غرض و غایت سے بے بہرہ ہیں اور ان کی معلومات کیلئے

ضروری ہے کہ اسے بار بار سامنے لایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ طلوعِ اسلام ان مقالات و خطابات کو تکرار و اصرار شائع کرتا رہتا ہے، اس امید کے ساتھ کہ —— شاید کہ خود را باز آفرینی!

اسی مقصد کے پیشِ نظر، یومِ پاکستان (۲۳ مارچ) کی تقریب پر سطورِ ذیل پیشِ خدمت ہیں۔

اسلام، ایک زندہ نظامِ حیات بننے کے لئے، اپنی آزاد مملکت کا متقاضی ہے۔ یہ وہ شرط ہے جس کے پورا نہ ہونے سے وہ دیگر مذاہب کی طرح ایک مذہب بن کر رہ جاتا ہے، دین یعنی نظامِ حیات نہیں بن سکتا۔ (مثلاً) اس نظام کے بنیادی ستون اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہیں، اور اس کا اصل الاصول، امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔ ہمارے مروّجہ تصورِ اسلام کی رُو سے، اقامتِ صلوٰۃ کے معنی ہیں صرف نماز پڑھنا اور ایتائے زکوٰۃ سے مفہوم غریبوں اور گداگروں کو کچھ پیسے بطورِ خیرات دے دینا۔ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے مقصود ہے لوگوں کو وعظ و نصیحت کرنا۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی بات کے لئے بھی اپنی آزاد مملکت کی ضرورت نہیں۔ یہ فرائض، ہم انگریز کے عہدِ غلامی میں بھی آزادانہ ادا کر سکتے تھے اور آج بھارت کا مسلمان، بایں ہمہ بے بسی و بے کسی، انہیں اپنے طور پر ادا کر سکتا ہے۔ لیکن قرآنِ کریم ان کی ادائیگی کے لئے اپنی حکومت کا قیام لازمی شرط قرار دیتا ہے جہاں کہتا ہے کہ اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ نَہَوۡا عَنِ الۡمُنۡکَرِ ؕ وَ لِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الۡاُمُوۡرِ۔ (۲۲/۴۱) یہ وہ لوگ ہیں (یعنی جماعتِ مومنین) کہ جب انہیں حکومت ملے گی تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا انصرام کریں گے۔ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان کا فریضۂ حیات ہوگا۔ یا (مثلاً) مذہبی سطح پر اسلام سے مقصود یہ ہے کہ انسان خدا کی عبادت کرے اور شرک سے مجتنب رہے یعنی بتوں کی پرستش نہ کرے۔ اس مقصد کے لئے بھی اپنی آزاد مملکت کی ضرورت نہیں۔ یہ ہر مقام پر، ہر حال میں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن قرآنِ کریم میں ہے کہ دین کے تمکن کے لئے استخلاف فی الارض ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر نہ خدا کی عبودیت اختیار کی جا سکتی ہے اور نہ شرک سے اجتناب ممکن ہے۔ سورۂ نور میں ہے کہ خدا نے تم سے حکومت کا وعدہ کر رکھا ہے تاکہ تم اس کی عبودیت اختیار کر سکو اور شرک سے بچ سکو —— یَعۡبُدُوۡنَنِیۡ لَا یُشۡرِکُوۡنَ بِیۡ شَیۡئًا (۲۴/۵۵)۔ جب رسول اللہؐ نے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا تو قبیلہ بنی عامر کا ایک بہت بڑا سردار آپ کے پاس آیا اور اس دعوت کے مقاصد کے متعلق وضاحت چاہی۔ آپ کی وضاحت پر اس نے پوچھا کہ اگر میں ان امور پر کاربند ہو گیا تو مجھے کیا ملے گا؟ آپؐ نے فرمایا کہ جنت، یعنی باغ و بہارِ آخرت —— ہمیشہ رہنے والی زندگی —— اس نے کہا کہ یہ بعد کی بات ہے۔ میں یہاں کے متعلق معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ —— نعم النصر والتمکین فی البلاد - اس دنیا میں فتوحات اور حکومت حاصل ہوگی۔ (الکامل)

اسلام کا تقاضا

یہ تھا اسلام کے دین (یعنی زندہ نظامِ حیات) بننے کا تقاضا جس کے پیشِ نظر علامہ اقبالؒ نے پاکستان کا تصور پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ

اس سے اسلام، اپنی تعلیم اور ثقافت کو پھر سے زندگی اور حرکت عطا کر سکے گا اور انہیں عصرِ حاضر کی روح کے قریب تر لانے کے قابل بنا سکے گا۔ (خطبۂ الٰہ آباد ۱۹۳۰ء)

اس سے بھی پہلے انہوں نے اپنے خطبات میں اس حقیقت کی وضاحت کر دی تھی کہ

> اسلامی نقطۂ نگاہ سے مملکت اس کوشش کا نام ہے جس کی رُو سے اسلام کے مثالی تصورات کو زمان و مکان کی قوتوں میں منتقل کیا جاتا ہے۔ یہ درحقیقت ان بلند تصورات کو انسانی ہیئتِ اجتماعیہ میں منتقل کرنے کا نام ہے۔

اس مملکت میں عبادت نام ہوتا ہے قوانینِ خداوندی کی محکومیت اختیار کرنے کا اور شرک سے مفہوم ہوتا ہے انسانوں کے خود ساختہ احکام و قوانین کی اطاعت۔ اقامتِ صلوٰۃ سے مقصود ہوتا ہے ایک ایسے معاشرہ کا قیام جس میں تمام افرادِ معاشرہ ان قوانین کا از خود، بطیبِ خاطر، اتباع کرتے جائیں[1]۔ اور ایتائے زکوٰۃ سے مفہوم ہوتا ہے تمام افرادِ معاشرہ (بلکہ عالمگیر انسانیت) کو سامانِ نشوونما مہیا کرنا۔ اس میں امر بالمعروف کے معنی ہوتے ہیں ان احکام و ضوابط کا نافذ کرنا جنہیں قرآن صحیح تسلیم کرتا ہے اور ان سے قانوناً روکنا جنہیں وہ مذموم قرار دیتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں علامہ اقبالؒ نے لکھا تھا کہ

> اسلام، تخت و تاج سے وفاشعاری کا مطالبہ نہیں کرتا۔ وہ صرف خدا (کے قوانین) سے عہدِ وفا استوار کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ (خطبات)

اور قائداعظمؒ نے کہا تھا کہ

> اسلامی حکومت میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام و اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہوتی ہے۔ (حیدرآباد دکن ۱۹۴۱ء)

یہ ہے ایک اسلامی مملکت کی تخلیق و تشکیل کی وجہِ جواز۔ اور یہ تھی وہ بنیاد جس پر مطالبۂ پاکستان کی عمارت استوار کی گئی تھی اور جس کے لئے اس مملکت کو حاصل کیا گیا تھا۔

لوحِ سادہ

آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ نبی اکرمؐ نے جب اسلام کی انقلابی دعوت پیش کی تو اس میں مخالفین کے ساتھ سب سے بڑی وجۂ نزاع اور سبب سے شدید سببِ تصادم کیا تھا؟ انہیں زندگی کے اس نظامِ نو کی طرف دعوت دی جاتی تھی اور وہ اس کے جواب میں کہتے تھے کہ ـــــ إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَارِهِم مُّهْتَدُونَ۔ (۴۳/۲۲)۔ ہم اس نئے نظام کو اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ہم اسی مسلک پر چلتے رہنا چاہتے ہیں۔ جو ہمارے اسلاف سے ہم میں متوارث چلا آرہا ہے۔ ہم انہی کے نقوشِ قدم کا اتباع کریں گے۔ ہم اپنی روایاتِ کہنہ کو نہیں چھوڑنا چاہتے۔

---

[1] اجتماعاتِ صلوٰۃ اسی نظام کا ایک گوشہ اور اسی مقصود کے حصول کا ایک ذریعہ ہیں۔

اُن سے اس کے جواب میں کہا جاتا کہ ـــــ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ (۴۳/۲۴) جو کچھ تمہارے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ اگر یہ اس سے بہتر ہو جس پر تم اپنے آباؤ اجداد کی تقلید میں چلے جا رہے ہو، تو کیا تم پھر بھی اپنے اسلاف کے مسلک ہی کو ترجیح دو گے؟ وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہاں! ہم اسی مسلک کا اتباع کریں گے ہمیں کسی نظامِ نو کی ضرورت نہیں ـــــ حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (۵/۱۰۴)۔ وہ مسلک ہمارے لئے ہر اعتبار سے کافی ہے۔
یہ تھی وہ بنیادی کشمکش جو اس قدر شدید تصادمات کا موجب بنی۔ جب ان مخالفین نے دیکھا کہ یہ نظام زور پکڑتا جا رہا ہے تو انہوں نے چاہا کہ اس سے کچھ مفاہمت کی صورت نکل آئے۔ یعنی کچھ باتیں اس نظامِ جدید کی لے لی جائیں اور کچھ ان کے مسلکِ آباء کی۔ اور دونوں کے امتزاج سے ایک نظام وضع کر لیا جائے۔ لیکن دین کے نقطۂ نگاہ سے ایسا کرنا شرک ہوتا اس لئے رسول اللہ سے بتاکید کہہ دیا گیا کہ وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا۔ دیکھنا! ان لوگوں کی طرف ذرا سا بھی جھک نہ جانا۔ اگر تم نے ایسا کیا تو فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ۔ تمہاری جماعت بھی اسی عذاب میں گرفتار ہو جائے گی جس میں یہ لوگ ماخوذ ہیں اور جس سے نکالنے کے لئے انہیں اس نظام کی طرف دعوت دی جا رہی ہے۔

لہٰذا، ایک قرآنی مملکت کی تشکیل کے لئے پہلا قدم یہ ہے کہ ان تمام نظریاتِ حیات و تصوراتِ زندگی، ان تمام روایاتِ کہنہ اور مسالکِ قدیمہ کو پرکھا جائے جو اس قوم میں متوارث چلے آ رہے ہیں۔ اس مملکت کا بنیادی پتھر ـــــ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ـــــ ہے۔ اس میں لَآ اِلٰهَ کے معنی یہ ہیں کہ تمام مروجہ تصورات کا از سرِ نو جائزہ لیا جائے۔ اس کے بغیر اس جدید نظام کی عمارت (جس کی بنیاد اِلَّا اللّٰهُ پہ استوار ہوتی ہے) قائم ہو ہی نہیں سکتی۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ ؎

ہر بنائے کہنہ کا باداں کنند
اوّل آں بنیاد را ویراں کنند

اسلام میں "بت پرستی" کو شرک قرار دیا گیا ہے۔ بُت تو فارسی زبان کا لفظ ہے۔ قرآن کریم میں اس کے لئے اَوْثَان کا لفظ آیا ہے جو وَثَن کی جمع ہے اور وثن کے معنی ہوتے ہیں جمود و تعطل، عدمِ حرکت، جامد و غیر متحرک ہو جانا ـــــ اس بنیادی مفہوم کے اعتبار سے ہر وہ تصور یا نظام جس میں حرکت نہ رہے اور جامد ہو جائے وَثَن ہے۔ جب قرآنی ضابطۂ حیات کو عملی شکل دے دی جائے تو اس سے ایک ایسا معاشرہ وجود میں آتا ہے جو حرکتِ پیہم اور سعیٔ مسلسل کا آئینہ دار ہوتا ہے ـــــ "حرکتِ پیہم" کے معنی یہ ہیں کہ وہ معاشرہ، قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے زمانہ کے بدلتے ہوئے اور بڑھتے رہنے والے تقاضوں کا ساتھ دیتا چلا جاتا ہے۔ یوں یہ نظام ایک ذی حیات تحریک (DYNAMIC MOVEMENT) کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اگر یہ کسی ایک مقام پہ رک جائے، اس میں جمود پیدا ہو جائے تو یہ وثنیت ہو گی۔ یہ وہ وثن (بت) ہے جس کی پرستش وہ قومیں کرتی ہیں جن پہ ذہنی جمود اور عملی تعطل چھا چکا ہو۔ حیرت ہے کہ ہم نے قرآن کے اس عظیم نکتہ کو پس پشت ڈال دیا اور مغرب کے مفکرین کی سمجھ میں یہ بات آ گئی۔ چنانچہ "وائٹ ہیڈ" لکھتا ہے کہ

بت پرستی کی کنہ درحقیقت مروجہ خداؤں پہ مطمئن ہو کر بیٹھ جانا ہے۔[1]

---

[1] A. N. WHITEHEAD — ADVENTURE OF IDEAS — P. 12.

اس قسم کی بت پرستی میں، ایک زندہ اور متحرک نظامِ حیات کے تصورات و مناسک کی محض شکلیں باقی رہ جاتی ہیں۔ ان کے معانی و مفہوم ختم ہو جاتے ہیں۔ مذہب' دین کی ممی شدہ لاش ہوتا ہے۔ ان بے روح رسوم، اور بے جان معتقدات سے چپکے رہنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے' اس کے متعلق وائٹ ہیڈ کہتا ہے کہ

> زندگی کے بے جان ہیکلوں کے ساتھ چپکے رہنے کا نتیجہ سست رفتار زوال ہوتا ہے جس میں ان رسوم کو بلا نتیجہ دہرایا جاتا ہے۔ اس سے تہذیب و ترقی کا محض سراب باقی رہ جاتا ہے۔ حقیقت غائب ہو جاتی ہے۔ (ایضاً)

انسان اور حیوان میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ حیوان' بلا سوچے سمجھے اور بلا اختیار و ارادہ' اپنے اسلاف کے مسلک پر چلے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان میں آگے بڑھنے اور کچھ اور بننے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ بکری کا بچہ بکری ہی بن سکتا ہے۔ اس سے آگے نہیں جا سکتا۔ نوعِ انسان کی یہ خوش قسمتی ہے کہ انسانی تاریخ میں ایسے ادوار آتے رہے جن میں تقلید کی ان برفانی سلوں کو توڑ کر کاروانِ انسانیت کے لئے آگے بڑھنے کا راستہ ہموار کیا گیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج کا انسان بھی، اپنے اسلاف کی طرح، غاروں میں پڑا زندگی بسر کرتا۔ یاد رکھئے، جوہرِ زندگی کی نمود، اپنے اختیار و ارادہ اور فکر و بصیرت سے، تعمیری کام سرانجام دینے سے ہوتی ہے۔ اگر وہ کام جنہیں عام طور پر نیکی کہا جاتا ہے، محض تقلیداً کئے جائیں تو یہ انسانی زندگی میں نشوونما ارتقاء کا موجب نہیں بن سکتے۔ انسانی زندگی میں (MORAL) تو خیر بڑی چیز ہے، اس میں (IMMORAL) ہونا اتنا تباہ کن نہیں جتنا ہلاکت آفریں (AMORAL) ہونا ہے۔ تقلید میں انسان (AMORAL) ہو جاتا ہے۔

یہی وہ جمود ہے جسے توڑنے کے لئے اقبالؒ کہتا ہے کہ

تراشش از تیشۂ خود جادۂ خویش — براہِ دیگراں رفتن عذاب است

گر از دستِ تو کارے نادر آید — گناہے ہم اگر باشد ثواب است

قرآن کریم نے اپنا تعارف کراتے یا یوں کہئے کہ اپنے نزول کا مقصد بتاتے ہوئے کہا ہے کہ إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ (97/1)۔ یعنی قرآن دنیا میں نئی اقدار لایا ہے۔ اس کی آمد سے ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے تمام قدیم پیمانے الٹ گئے ہیں۔ اور ان کی جگہ ان نئے پیمانوں نے لے لی ہے۔ قرآن کی اولین مخاطب قوم کی طرف سے جو اس کی مخالفت ہوئی تھی تو اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ اپنے قدیم پیمانوں کو، جو ان کے اسلاف کی طرف سے متوارث چلے آرہے تھے، ان جدید پیمانوں سے بدلنے پر آمادہ نہیں تھے۔ اقبالؒ نے جب پاکستان کا تصور دیا تھا تو اس مملکت کو وجود میں لانے کا مقصد یہ بتایا تھا کہ

> اس سے اسلام کو ایسا موقعہ میسر آجائے گا جس سے یہ اس ٹھپہ کو مٹا سکے گا جو عرب ملوکیت نے زبردستی اس پر لگا رکھا ہے۔ (خطبۂ الٰہ آباد)

ہمارا مروجہ مذہب، ہماری شریعت، ہمارا کلچر، ہماری روایات، ہمارا فلسفۂ حیات، ہمارے رسوم و مناسک، غرضیکہ

روش کہن

ہر وہ شے جسے ہم اس وقت عام طور پر اسلامی کہہ کر پکارتے ہیں، عرب ملوکیت کے دور کی پیدا کردہ ہے۔ اقبالؒ نے اس کے لئے "عجمی اسلام" کی اصطلاح وضع کی تھی کیونکہ یہ پیدا تو عرب

ملوکیت کے زمانہ (بالخصوص دورِ عباسیہ) میں ہوا تھا لیکن تھا عجم سے مستعار لئے ہوئے تصوّرات کا مجموعہ۔ اسی لئے حکیم الامت نے مروجہ اسلام پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ ؎

شریعت، طریقت، تصوّف، کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام

پاکستان کی تشکیل سے مقصد "ان" بتانِ عجم" کو حریمِ کعبہ سے نکال کر، اسے خالصتہً "خدا کے گھر" میں تبدیل کرنا تھا۔ یعنی ہمارے ہاں "جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے" اس کا قرآن کی روشنی میں جائزہ لے کر معاشرہ کو از سرِ نو مستقل اقدارِ خداوندی کے خطوط پر متشکل کرنا۔ ان مستقل اقدار کی ملکی سی جھلک ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔

حاکم و محکوم کا امتیاز

قرآنی مملکت میں حاکم اور محکوم کا تصور نہیں ہوتا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اس مملکت کا بنیادی فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ قرآن کریم نے یہ فریضہ امت کے کسی خاص گروہ کا قرار نہیں دیا، بلکہ ساری کی ساری امت کا قرار دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۳/۱۱۰)۔ تم وہ بہترین اُمت ہو جسے ہم نے نوعِ انسان کی بہبود کے لئے متشکل کیا ہے۔ تمہارا فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے، تقسیمِ عمل کے اصول کے مطابق، مختلف کام مختلف افراد کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں۔ گویا یہ ایک ٹیم ہوتی ہے جو باہمی تعاون سے زندگی کو اس کی منزلِ مقصود تک لے جاتی ہے۔ اس میں، افسر اور ماتحت یا حاکم اور محکوم کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ الدّین، یعنی قرآنی نظام کی خصوصیت کبریٰ یہ بتائی گئی ہے کہ اس میں لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا۔ وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلَّهِ (۸۲/۱۹)۔ کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر نہ کسی قسم کا کوئی کنٹرول یا حقِ حکومت رکھے، نہ کوئی کسی دوسرے کا محتاج ہو۔ اس میں تمام معاملات قوانینِ خداوندی کے مطابق طے پاتے چلے جائیں۔ اس میں کسی کو اس کا حق نہیں ہوتا کہ دوسرے سے کہے کہ كُونُوا عِبَادًا لِّي (۳/۷۹)۔ تم میرے محکوم ہو جاؤ۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

کس نہ گردد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں، این است و بس

جب عہدِ فاروقی میں روم کا سفیر مدینہ آیا اور اس نے دریافت کیا کہ تمہارا بادشاہ کون ہے، تو صحابہؓ کی طرف سے اس کا جواب یہ ملا تھا کہ مالنا ملک۔ بل لنا امیر۔ ہمارا بادشاہ کوئی نہیں۔ ہمارا صرف امیر ہے۔ واضح رہے کہ لفظ امیر کے بنیادی معنی مشورہ کرنے والے یا راہ نمائی کرنے والے کے ہیں۔ امت، جس شخص کے سپرد یہ امانت کرتی ہے، اس کا فریضہ کیا ہوتا ہے، اس کے متعلق امت کے سب سے بڑے منتخب کردہ امیر، صدیق اکبرؓ نے اپنے پہلے خطبۂ خلافت میں ان الفاظ میں وضاحت کر دی تھی کہ

یاد رکھو! تم میں سے ہر کمزور طاقتور ہے جب تک میں اس کا حق نہ دلاؤں اور ہر طاقتور کمزور ہے جبتک

اس سے کمزور کا حق نہ لے لیا جائے۔

اس فریضہ کو حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں دہرایا تھا کہ

> یاد رکھو! اگر کوئی شخص کسی پر زیادتی کرے گا تو میں اس وقت تک اسے نہ چھوڑوں گا جب تک اس کا ایک رخسار زمین پر ٹکا کر دوسرے رخسار پہ پاؤں نہ ٹکا دوں تاآنکہ وہ حق کے سامنے سپر انداز ہو جائے۔ لیکن تم میں سے حقدار کے لئے میں اپنا رخسار زمین پر رکھ دوں گا۔

خلافت اور ملوکیت میں فرق

وہ اکثر لوگوں سے دریافت کرتے رہتے کہ میں کہیں خلافت سے روگردانی کر کے بادشاہت کی طرف تو نہیں جا رہا؟ ایک دفعہ جب انہوں نے یہی سوال دہرایا تو ایک شخص نے جواب میں کہا کہ خلافت اور بادشاہت کا فرق بڑا نمایاں ہے اس لئے اس میں کسی قسم کا اشتباہ نہیں ہو سکتا کہ ہمارے ہاں خلافت ہے یا بادشاہت۔ خلیفہ تمام افرادِ معاشرہ کے حقوق کا محافظ ہوتا ہے اور بادشاہ ان کے حقوق میں ظلم اور جبر کرتا ہے۔ وہ ایک طرف سے لوٹتا ہے اور دوسری طرف اپنے مقاصد کے لئے خرچ کرتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ خلیفہ ہیں، بادشاہ نہیں۔

انہوں نے اپنے پہلے خطبہ میں کہا تھا کہ

> لوگو! میرے اوپر تمہارے جو حقوق ہیں، میں ان کی وضاحت کرتا ہوں۔ تمہارا سب سے پہلا حق یہ ہے کہ تمہارے اموال میں سے کوئی چیز نہ لوں۔ مگر قانونِ خداوندی کے مطابق۔ اور جو کچھ لوں اس میں سے کچھ خرچ نہ کروں مگر حق کے مطابق۔

اور یہ بھی کہا تھا کہ

> تمہارا مجھ پر یہ بھی حق ہے کہ جب تم مہمات کے سلسلہ میں اپنے بچوں سے دور ہو جاؤ تو میں ان بچوں کا باپ بنوں۔

وہ کہا کرتے تھے کہ میری اور دیگر افرادِ معاشرہ کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی پارٹی سفر کے لئے نکلے تو سب لوگ اپنے پیسے ایک شخص کے سپرد کر دیں کہ وہ سفر کے سلسلہ میں ضروری اخراجات کرتا جائے اور اس کا حساب رکھے لہٰذا، مسلمانوں کے مال میں میرا حصہ اتنا ہی ہے کہ کپڑوں کے دو جوڑے، ایک گرمی کا اور ایک سردی کا، اور میرے اور میرے اہل و عیال کے لئے اتنا کھانا جو قریش کے ایک عام آدمی کی خوراک ہے۔

اہل و عیال کے معاملہ میں ایک طرف قرآن نے انہیں زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۱۸/۴۶) کہا ہے۔ انہیں آنکھوں کی ٹھنڈک (قُرَّةَ اَعْيُنٍ ۲۵/۷۴) کا موجب قرار دیا ہے۔ لیکن دوسری طرف یہ بھی بتا دیا ہے کہ یاد رکھو۔ اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (۸/۲۸) یہ انسان کے لئے بہت بڑی آزمائش کا موجب بن جاتے ہیں اور مقاصدِ حیات میں تمہارے سب سے

بیوی بچے فتنہ نہ بن جائیں

بڑے دشمن اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ (۶۴/۱۴)۔ یاد رکھو! تمہاری اولاد اور بیویاں بعض اوقات تمہاری سب سے بڑی دشمن ہوتی ہیں۔ تمہاری زندگی کے بڑے بڑے بلند مقاصد انہی کے ہاتھوں تباہ ہوتے ہیں۔ ان کی وجہ سے تمہارے پاؤں میں ایسی لغزش آتی ہے کہ تم اپنے مقامِ بلند و رفیع سے گر کر چکنا چور ہو جاتے ہو۔ اس لئے فَاحْذَرُوْهُمْ۔ ان سے

بہت محتاط رہنا۔ قرآنی مملکت میں اس لغزش کی گھاٹی کو ہمیشہ نگاہوں کے سامنے رکھا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ کی ایک بیوی تھی جسے ان کے مزاج میں بڑا دخل تھا۔ جب امورِ خلافت ان کے سپرد ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ وہ امورِ مملکت میں دخیل ہوتی ہے اور بعض اوقات غلط سفارشات کر دیتی ہے۔ جب اس نے تنبیہ کے باوجود اپنی اس عادت کو نہ بدلا تو آپ نے اُسے طلاق دے دی۔ اولاد کے بارے میں ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ عراق کے گورنر (حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ) نے ان کے دو لڑکوں (جناب عبداللہ اور عبید اللہ) کو کچھ رقم خزانہ میں داخل کرنے کے لئے دی۔ انہوں نے کہا کہ اگر ہم اس رقم کو قرض سمجھ کر اس سے تجارت کر لیں اور پھر اصل رقم بیت المال میں جمع کرا دیں تو اس کی اجازت ہے؟ انہوں نے اجازت دے دی۔ جب حضرت عمرؓ کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے کہا کہ اس مال کی تجارت سے جو منافع ہوا ہے وہ بھی بیت المال میں داخل کرانا ہوگا۔ بیٹوں نے کہا کہ گورنر نے انہیں اس کی اجازت دے دی تھی۔ اس پر آپ نے پوچھا کہ کیا اس نے کسی اور کو بھی اس قسم کی اجازت دی تھی یا تمہارے ہی ساتھ یہ رعایت برتی تھی۔ انہوں نے کہا کہ کسی اور کو تو اس قسم کی اجازت نہیں ملی تھی۔ اس پر آپ نے کہا کہ اس نے یہ رعایت تمہیں امیر المومنین کے بیٹے ہونے کی وجہ سے دی ہے۔ اور یہیں سے فساد کی ابتداء ہوا کرتی ہے۔ قرآنی مملکت میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے میں اسے پہلے کو واپس نہیں لینا چاہتا۔۔۔۔ اس باب میں ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ جب وہ امہات المومنینؓ (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات) کو بیت المال سے کوئی چیز بطور تحفہ بھیجتے تو حضرت حفصہؓ کا حصہ آخر میں لگاتے کہ اگر مقدار میں کچھ کمی رہ جائے تو وہ اُن کے حصہ میں ہو۔ یہ اس لئے کہ حضرت حفصہؓ، حضرت عمرؓ کی بیٹی بھی تھیں۔۔۔۔ قحط کے زمانے میں آپ نے گلی میں ایک بچی کو دیکھا کہ بھوک سے نڈھال ہو رہی ہے۔ آپ کو اس سے بڑا صدمہ ہوا۔ کہا کہ کوئی پہچانتا ہے کہ یہ بچی کون ہے؟ بیٹا ساتھ تھا۔ اس نے کہا کہ آپ کی پوتی (فلاں) ہے۔ آپ نے کہا کہ اس کی حالت ایسی کیوں ہو رہی ہے۔ اس نے کہا کہ قحط کی وجہ سے جتنا کچھ ملتا ہے اس میں یہ حالت نہ ہوگی تو اور کیا ہوگا۔۔۔؟ آپ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور کہا کہ پھر جو حال قوم کے دوسرے بچوں کا وہی عمرؓ کی پوتی کا ہوگا۔ تنگی ہوگی تو سب پر اور کشادگی ہوگی تو سب کے لئے۔ ان کا دستور تھا کہ

> جب مملکت میں کوئی امتناعی حکم نافذ کرتے تو اپنے گھر والوں کو جمع کر کے ان سے کہتے کہ میں نے فلاں فلاں چیز سے منع کیا ہے۔ اور لوگ تمہاری طرف ایسے دیکھ رہے ہیں جیسے پرندے گوشت کی طرف اگر تم محتاط رہو گے تو وہ بھی رہیں گے۔ اور اگر تم میں سے کسی نے ایسا کیا تو چونکہ تمہارے اعمال کا اثر دوسروں پر بھی پڑتا ہے تمہیں ان سے دگنی سزا دوں گا۔ اب تمہارا اختیار ہے، چاہے آگے بڑھو اور چاہے پیچھے ہٹو۔ (تاریخ عمرؓ ابن جوزی)

عدل

قرآنی مملکت کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر ایک سے عدل ہوتا ہے۔ عدل کی ایک شکل یہ ہے کہ ہر متنازعہ فیہ معاملہ کا فیصلہ قانون کے مطابق کیا جائے اور اس میں کسی کی رو رعایت نہ کی جائے۔ یہی ہے وہ مملکت جس میں ہر صاحبِ اقتدار سے یہ کہا جاتا ہے کہ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ۔ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ۔ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ

تمہیں مملکت میں صاحبِ اختیار اس لئے بنایا گیا ہے کہ تم لوگوں کے فیصلے حق کے ساتھ کرو اور اس میں اپنے جذبات کو کبھی دخیل نہ ہونے دو۔

پہلی کہا گیا ہے کہ لوگوں کے متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ حق کے ساتھ کرو۔ یہ نکتہ بڑا غور طلب ہے۔ عدل کا عام تصور یہی ہے کہ اگر معاملات کا تصفیہ ملک کے رائج الوقت قانون کے مطابق ہو تو کہا جائے گا کہ عدل کا تقاضا پورا ہو گیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر خود وہ قانون جس کے مطابق فیصلہ ہوا ہے، عدل پر مبنی نہیں تو اس کے مطابق فیصلہ کو مبنی برعدل کیسے کہا جائے گا؟ اگر قانون کے استعمال میں جذبات اثر انداز ہو سکتے ہیں تو قانون سازی میں جذبات کیوں اثر انداز نہیں ہو سکتے! یہ وجہ ہے کہ قرآنی مملکت میں قانون سازی کا اختیار کسی کو حاصل نہیں ہوتا۔ اس میں تمام قوانین، اصولی طور پر، خدا کے متعین فرمودہ (قرآن کی دفعتین کے اندر محفوظ ہوتے ہیں۔ اور مملکت کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان قوانین کو اپنے زمانے کے حالات کے مطابق نافذ العمل بنائے۔ قرآن کریم کا تعارف سب سے پہلی آیت میں 'الکتاب' کہہ کر کرایا گیا ہے۔ الکتاب ضابطۂ قوانین کو کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں چند ایک قوانین تفصیلی طور پر دیئے گئے ہیں اور باقی اصولی طور پر درج ہیں۔ ان اصولی قوانین کی جزئیات، ہر زمانے کی امت، اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق باہمی مشاورت سے مرتب کرے گی۔ ان جزئیات (یا بائی لاز) میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق تغیر و تبدل ہوتا رہے گا۔ لیکن اصولی قوانین ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔ ان میں تبدیلی کا حق کسی ایک فرد یا پارلیمان تو ایک طرف، ساری دنیا کی آبادی کو بھی حاصل نہیں ہوگا۔ جو مملکت، قرآنی قوانین کے مطابق فیصلے کرے گی اسے اسلامی مملکت کہا جائے گا۔ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو خدا کی طرف سے نازل کردہ کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے انہی کو کافر کہا جاتا ہے

لہٰذا، قرآنی مملکت میں ہر فیصلہ قرآنی قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔ اور ان قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے میں، فیصلہ کرنے والے کے ذاتی رجحانات و میلانات اثر انداز ہوتے ہیں اور نہ ہی کسی قسم کے خارجی مؤثرات دخیل کار۔

لَا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ (۲/۱۲۳)

اس دور میں کوئی شخص (قانون کے مقابلہ میں) کسی دوسرے شخص کے کام نہیں آسکے گا، نہ ہی کسی کی سفارش مجرم کو بچا سکے گی۔ نہ ہی اس سے کچھ لے کر اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ نہ ہی کوئی کسی اور طرح مجرم کی مدد کر سکے گا۔

اس میں مجرم چھپا نہیں رہ سکتا، دور سے پہچانا جا سکتا ہے يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ (۵۵/۴۱) اس میں مجرم اپنی پیشانیوں سے پہچانے جائیں گے"۔ اس میں انتظام ایسا ہوگا کہ مجرم، شریف انسانوں سے بالکل الگ نظر آئیں — وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ (۳۶/۵۹) تاکہ کوئی شخص ایسے لوگوں سے دھوکا نہ کھا سکے۔ اس میں کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی مجرم، مواخذہ سے بچ جائے یا کوئی بے گناہ یوں ہی دھر لیا جائے۔ لَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا (۶/۱۶۵) اس میں ہر شخص اپنے اعمال کے مطابق بدلہ پاتا ہے۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (۶/۱۶۵) اور کوئی بوجھ اٹھانے والا

کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔

قرآنی مملکت میں، بڑی سے بڑی شخصیت بھی قانون کے دائرے سے باہر نہیں ہوتی۔ اس باب میں، اور تو اور، خود حضور رسالتمآبؐ کی زبانِ اقدس سے بھی یہ اعلان ہوا کہ

اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (۶/۱۵)

اگر میں بھی قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کروں تو اس کے مواخذہ سے سخت ڈرتا ہوں۔

اور اس کے بعد فرمایا کہ اگر میری چہیتی بیٹی ـــــ فاطمہؓ ـــــ بھی قانون شکنی کرے تو میں اسے بھی سخت سزا دوں گا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں مصر کے گورنر کے بیٹے نے ایک مصری کو کسی بات پہ یہ کہہ کر تھپڑ سے پیٹا کہ تم بڑے آدمیوں کی اولاد سے گستاخی سے پیش آتے ہو تو آپ نے گورنر، اس کے بیٹے اور اس مصری کو مدینہ بلوا بھیجا۔ مصری کے ہاتھ میں تھپڑ دیا اور کہا کہ اسے اسی طرح مارو اور کہو کہ تم نے دیکھ لیا کہ بڑوں کی اولاد کا حشر کیا ہوتا ہے؟ اس کے ساتھ ہی اس گورنر کو بھی تادیب کی کہ اگر تم نے بیٹے کی تربیت صحیح کی ہوتی تو اس کے سر میں یہ خناس کیوں سماتا کہ وہ بڑوں کی اولاد ہے اس لئے اُسے قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کا حق حاصل ہے۔ خود حضرت عمرؓ کو ایک مرتبہ ایک عدالت میں پیش ہونے کا اتفاق ہوا تو جج نے انہیں امتیازی مقام پہ بیٹھنے کی پیش کش کی۔ آپ نے اس پیش کش کو مسترد کر دیا اور مدعی کے برابر بیٹھ گئے۔ مقدمہ ختم ہونے کے بعد آپ نے جج کو لکھا کہ تم جج بننے کے قابل نہیں ہو سکتے جب تک تم امیر المومنین اور ایک عام شہری کو یکساں نہ سمجھو۔

قرآنی مملکت میں یہ کیفیت تو عدالت کی ہوتی ہے لیکن اس میں مناسب تعلیم و تربیت سے خود افرادِ معاشرہ میں اس قسم کی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر ان سے کبھی کوئی لغزش سرزد ہو جائے تو وہ خود اپنے آپ کو اپنے جرم کی سزا کے لئے پیش کر دیتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کا ایمان یہ ہوتا ہے کہ ارتکابِ جرم کا کوئی اور شاہد ہو یا نہ ہو، خود خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل سب سے بڑا گواہ ہوتا ہے۔ وہ گواہ جس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

یَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْیُنِ وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ۔ (۴۰/۱۹)

وہ نگاہ کی خیانت اور دل کے اندر گذرنے والے خیالات تک سے واقف ہوتا ہے۔

یہی تھی وہ تعلیم جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک رات حضرت عمرؓ حسبِ دستور افرادِ معاشرہ کے حالات کا براہِ راست مطالعہ کرنے کے لئے گشت کر رہے تھے کہ آپ نے سُنا کہ ایک خیمہ کے اندر ماں اپنی بیٹی سے کہہ رہی ہے کہ دودھ میں تھوڑا سا پانی ملا کر اسے چولھے پر چڑھا دو۔ بیٹی نے کہا کہ امی! میں دودھ میں پانی نہیں ڈالوں گی کیونکہ خلیفہ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ ماں نے جواب دیا کہ پانی ڈال دو، خلیفہ اس وقت کہاں دیکھ رہا ہے۔ لڑکی نے کہا کہ خلیفہ تو نہیں دیکھ رہا لیکن وہ خدا تو دیکھ رہا ہے جس کا حکم خلیفہ نے ہم تک پہنچایا تھا۔

خلیفہ نے گھر آکر بیوی سے کہا کہ صبح اُس خیمہ میں جاؤ اور اس لڑکی کی ماں سے لڑکی کا رشتہ مانگ لو۔ ایسی لڑکی جس گھر میں آجائے گی وہ گھر نور سے بھر جائے گا۔

پہل کہاں سے ہو؟ لیکن افرادِ معاشرہ میں اس قسم کی تبدیلی اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب پہلے برسرِ اقتدار طبقہ خود اپنے کیریکٹر میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کرے۔ لوگ قانون کی اطاعت کرتے ہی

اس وقت ہی جب ان کے ارباب حل و عقد خود قانون کی اطاعت کریں۔ اسی طبقہ کے بگڑنے سے ساری قوم بگڑتی ہے اور اسی کے سنورنے سے ساری قوم سنور جاتی ہے۔ جب حضرت صالحؑ کو قوم ثمود کی اصلاح کے لئے بھیجا گیا تو آپ نے دیکھا کہ قوم تمام کی تمام بگڑی ہوئی ہے۔ اس کی اصلاح کی صورت کیا ہو گی؟ تو خدا کی طرف سے جواب ملا کہ گھبرانے کی بات کوئی نہیں ——— کَانَ فِی الْمَدِیْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ یُّفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ وَلَا یُصْلِحُوْنَ۔ (۲۷/۴۸)۔ مملکت کے مرکز میں قوم کے نو سرغنے ہیں اور وہی سارے فساد کا موجب ہیں اور قوم کے معاملات کو سنورنے نہیں دیتے۔ اگر وہ راہِ راست پر آجائیں تو ساری قوم سنور جائے گی۔ یہی تھی وہ حقیقت جسے حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ

> عوام میں اس وقت تک ٹیڑھ پیدا نہیں ہوتی جب تک ان کے لیڈر سیدھے رہتے ہیں۔ جب تک راعی اللہ کی راہ میں چلتا ہے، رعایا اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔ جہاں اس نے پاؤں پھیلائے، رعایا اس سے پہلے پاؤں پھیلا دیتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآنی مملکت میں، امیر کی اطاعت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرے۔ قرآن کریم نے اس باب میں واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِکْرِنَا۔ جو ہمارے قوانین کو فراموش کر دے۔ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ۔ اور اپنے مفاد اور جذبات کے پیچھے لگ جائے۔ وَکَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (۱۸/۲۸)۔ اور یوں اس کے معاملات قاعدے اور قانون کی حدود سے تجاوز کر جائیں تو اس کی اطاعت مت کرو۔ اسی بناء پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ

> اگر ایک ناک کٹا، سیاہ فام حبشی بھی تمہارا امیر ہو تو جب تک وہ کتاب اللہ کے مطابق تمہاری قیادت کرے، تم اس کے حکم کو سنو اور اس کی اطاعت کرو۔ (مسلم)

اسی اصول کو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے پہلے خطبۂ خلافت میں، ان الفاظ میں پیش کیا تھا کہ

> تم میری اطاعت اس وقت تک کرو جب تک میں اللہ کے احکام کی اطاعت کروں۔ اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت فرض نہیں۔

اور حضرت عمرؓ نے اسے ان الفاظ میں دہرایا تھا کہ

> یاد رکھو! کوئی صاحبِ اختیار دنیا میں اس مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا کہ وہ اگر خدا کے قوانین کی خلاف ورزی کرے تو اس کی اطاعت کی جائے۔

یہ اس لئے کہ قرآنی مملکت میں اطاعت صرف قوانینِ خداوندی کی ہوتی ہے، کسی انسان کی نہیں۔ ان کا امیر ان قوانین کے مطابق معاشرہ متشکل کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اگر وہ خود ہی ان قوانین کی اطاعت نہ کرے تو دوسرے اس کی اطاعت کس طرح کریں گے؟ یہی وجہ ہے کہ اس نظام کے داعیٔ اول، حضور نبی اکرمؐ نے خود فرما دیا کہ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ۔ سب سے پہلے میں خود اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہوں۔

اس مقام پر اس نکتہ کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ امیر کی اطاعت اس وقت تک ہے جب تک وہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرے، تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر شخص کو اس کا اختیار دے دیا جائے کہ

جس وقت وہ سمجھے کہ امیر نے خدا کے کسی حکم کی اطاعت نہیں کی، وہ بغاوت کے لئے اٹھ کھڑا ہو۔ اس سے تلوار کی پھیل جاتی ہے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ قرآنی مملکت کے آئین میں اس قسم کا ضابطہ ہوگا کہ جس کی رُو سے خود امیرِ مملکت کے اقدامات پر نگاہ رکھی جائے گی اور جو بھی وہ حد سے تجاوز کرے آئینی اور قانونی طور پر اس کا مواخذہ ہو سکے گا۔ اور اگر وہ مجرم ثابت ہوگا تو اس کی جگہ دوسرا امیر مقرر کر دیا جائے گا۔

سوشل جسٹس

یہ تھا عدل — یعنی قانون کے مطابق چلنے کا ایک گوشہ۔ اس کا دوسرا گوشہ وہ ہے جسے آج کل کی اصطلاح میں عدلِ عمرانی (SOCIAL JUSTICE) کہا جاتا ہے۔ سوشل جسٹس کی اصطلاح آج کل بڑی عام ہو رہی ہے اور اس کا ہر جگہ چرچا سنائی دیتا ہے لیکن اس اصطلاح کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ اس کے متعلق ابھی تک متفق علیہ کچھ نہیں کہا گیا۔ یہ اصطلاح بھی، سوشلزم کی طرح، ہر ذہن میں الگ مفہوم کی حامل ہے۔ بنیادی طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اس سوسائٹی کو مبنی بر عدل (JUST) کہا جائے گا جس میں ہر فرد کو وہ کچھ مل جائے جس کا وہ حقدار ہے۔ لیکن یہیں سے پھر دوسرا سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ کس طرح متعین کیا جائے کہ کوئی شخص کس چیز کا حقدار ہے۔ مختلف افراد کے حق (یا واجب DUE) کا تعین، پہلے سوال سے بھی زیادہ مشکل اور اسی سے ساری پیچیدگیاں ابھرتی ہیں۔ ایک طرف سے جواب ملتا ہے کہ ایک شخص صرف اس کا حقدار ہے جو اسے معقول اخلاقی اصولوں (VALID MORAL PRINCIPLES) کے مطابق ملے۔ لیکن یہ اخلاقی اصول کیا ہیں؟ یہ سوال پھر بحث طلب رہ جاتا ہے۔ اس موضوع پر جو کچھ اس وقت تک میری نظروں سے گزرا ہے اس میں (EMIL BRUNNER) کا پیش کردہ مفہوم میرے نزدیک قرآنی تصور کے مطابق ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

> جو شخص فی الواقعہ سنجیدگی کے ساتھ کہتا ہے کہ فلاں بات مبنی بر عدل (JUST) اور فلاں ظلم پر مبنی (UNJUST) ہے، وہ درحقیقت کہتا یہ ہے کہ عدل اور ظلم کے ماپنے کا ایک ایسا پیمانہ ہے جو تمام انسانی قوانین، معاہدات، رسوم و رواج سے ماوراء ہے۔ وہ ایک ایسا معیار ہے جس سے تمام انسانی معیار ماپے اور پرکھے جا سکتے ہیں۔ یا تو اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ عدل کے لئے اس قسم کا مطلق، الوہیاتی معیار موجود ہے۔ ورنہ اس لفظ کا مفہوم انفرادی بن کر رہ جائے گا۔ جو ایک کے نزدیک قابلِ قبول ہوگا اور دوسرے کے نزدیک ناقابلِ تسلیم۔ عدل کے لفظ سے مفہوم یا تو خداوندی فیصلہ ہوگا جس کے ساتھ حقِ مطلق ہونے کی تقدیس شامل ہوگی اور یا پھر یہ محض کھوکھلے نگوں کی مینا کاری اور ملمع سازی ہوگی۔ (JUSTICE AND THE SOCIAL ORDER)

رزق کا حق

قرآن کی رُو سے عدل کی تعریف اسی قسم کی ہے۔ یعنی کسی شخص کو وہ کچھ مل جانا جس کا وہ از روئے قوانینِ خداوندی حقدار ہے، عدل کہلائے گا۔ اور یہ قوانین، قرآن کے اندر موجود ہیں۔ لہٰذا، قرآن کی رُو سے سوشل جسٹس کے معنی ہوں گے ہر شخص کو اس کا قرآنی حق ادا کر دینا۔ قرآنی مملکت اس قسم کے سوشل جسٹس کو عملاً

بروئے کار لانے کی ایجنسی ہے۔ ان ابدی اور غیر مشروط حقوق میں قرآن نے سب سے پہلے، ہر ذی حیات کے لئے رزق کا حق شامل کیا ہے۔ رزق کے معنی ہیں تمام وہ سامان اور ذرائع جن سے انسان کی جسمانی پرورش اور اس کی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی ہے۔

اس حق کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے کہ

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔ (۱۱/۶)

سطحِ ارض پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔

قرآنی مملکت، جو خدا کے نام پر قائم ہوتی ہے، خدا کی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کا فریضہ اپنے اوپر لیتی ہے۔ اس لئے تمام افرادِ معاشرہ سے واضح الفاظ میں کہتی ہے کہ

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ۔ (۶/۱۵۱)

(تم معاش کی طرف سے مطمئن ہو کر بلند مقاصدِ حیات کے حصول کے لئے کوشاں رہو) ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔

ہمارے ہاں یہ بحث اکثر و بیشتر نزاع بنی رہتی ہے کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے؟ وہ سرمایہ دارانہ ہے، رفاہی ہے یا اشتراکی۔ لیکن ہم اگر قرآنی مملکت کی اس عظیم ذمہ داری کو سامنے رکھیں جسے مندرجہ بالا آیت میں متعین کیا گیا ہے تو بات نکھر کر سامنے آجاتی اور سارا مسئلہ صاف ہو جاتا۔ اسلام میں معاشی نظام کا انداز کچھ اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ وہ مقصود بالذات نہیں۔ سوال سارا یہ ہے کہ وہ ذمہ داری جسے مملکت اپنے سر پر لیتی ہے وہ کس طرح کے معاشی نظام سے پوری ہو سکتی ہے ـــــ یعنی تمام افرادِ معاشرہ اور ان کی اولاد کے سامانِ زیست کی ذمہ داری ـــــ اسی کو ایتائے زکوٰۃ کہتے ہیں۔ یعنی نوعِ انسانی کو سامانِ نشوونما فراہم کرنا، اور جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا ہے، یہ قرآنی مملکت کے قیام کا بنیادی مقصد ہے۔ ظاہر ہے کہ مملکت اتنی عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو نہیں سکتی جب تک رزق کی پیداوار کے ذرائع اس کی تحویل میں نہ ہوں۔ رزق کی پیداوار کا بنیادی ذریعہ زمین ہے۔ اور قرآن کی رُو سے، زمین پر ـــــ جو خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ، انسانوں کی پرورش کے لئے عطا ہوئی ہے۔ انفرادی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسے قرآن نے سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ (۴۱/۱۰) قرار دیا ہے۔ یعنی اسے تمام ضرورتمندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہئے۔ کسی کی ملکیت میں نہیں چلا جانا چاہیئے۔ اسی حقیقت کو نبی اکرمؐ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ

زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ کے۔ اس لئے اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لئے رہنی چاہیئے۔

اس سلسلہ میں آپؐ نے پہلا اصلاحی قدم یہ اٹھایا کہ زمینداری کے نظام کو ختم کر کے یہ فیصلہ کر دیا کہ زمین کاشتکار کے پاس رہے گی اور وہ بھی اتنی جتنی وہ خود کاشت کر سکے۔ اس کے بعد جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں عراق کی وسیع و عریض زمینیں مسلمانوں کے قبضے میں آئیں تو ان کی تقسیم کے سوال پر اچھی طرح بحث ہوئی اور بالآخر فیصلہ یہ ہوا کہ انہیں افراد میں تقسیم نہ کیا جائے بلکہ مملکت کی تحویل میں رکھا جائے۔ چنانچہ مملکت کی طرف سے اعلان کر دیا گیا کہ ـــــ لَنَا رِقَابُ الْاَرْضِ ـــــ زمین مملکت کی رہے گی تاکہ اس کے مناسب انتظام سے افرادِ معاشرہ کو سامانِ رزق بہم پہنچایا جا سکے۔

ربوٰ کا مفہوم زمین کی ملکیت یا تحویل کے بعد سب سے اہم سوال حصولِ دولت کا ہے۔ عصرِ حاضر میں

معیشت کا یہ مسئلہ بڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ معاوضہ محنت (LABOUR) کا ہونا چاہیئے یا سرمایہ (CAPITAL) کا۔ اور جس انداز سے اس سوال پر بحث ہوتی ہے۔ اس سے ایسا نظر آتا ہے گویا یہ سوال دنیا کے سامنے پہلی مرتبہ آیا ہے۔ حالانکہ اربابِ فکر و نظر سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ قرآن کریم نے اس سوال کو تمت ہوئی حل کر دیا تھا۔ قرآن نے ربٰو کو حرام قرار دیا ہے۔ اور حرام بھی اس شدت کا کہ اس کے لئے کہا ہے کہ ایسا کرنا خدا اور رسول کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ ربٰو کا ترجمہ ہمارے ہاں سود کیا جاتا ہے۔ اور اس ترجمہ کی بناء پر یہ بحثیں چل نکلی ہیں کہ تجارتی سود (COM- MERCIAL INTEREST) اور بنکوں کا سود وغیرہ جائز ہے یا نہیں۔ آپ ذرا اس حقیقت پر غور کیجئے کہ قرآن نے ربٰو کے علاوہ اور بھی بہت سی باتوں کو حرام قرار دیا ہے۔ لیکن ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو مجرم قرار دیا ہے۔ اس کے برعکس ربٰو کی یہ کیفیت ہے کہ اسے حرام قرار دیتے ہوئے کہا کہ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰو۔ ربٰو میں سے جو کچھ کسی کے ذمے باقی ہے اسے چھوڑ دو اور اس کے بعد کہا کہ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (۲/۲۷۹) اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اسے خدا و رسول (اسلامی نظام) کی طرف سے اعلانِ جنگ سمجھ لو۔ اس سے آپ دیکھئے کہ ربٰو اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کے ارتکاب کو نظامِ حکومت کی طرف سے اعلانِ جنگ قرار دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ربٰو کے معنی ہیں " سرمایہ پر بڑھوتی " (سود تو اس کی صرف ایک شکل کا نام ہے) قرآن جس قسم کا نظام قائم کرنا چاہتا ہے اس میں سرمایہ کے معاوضہ کا اصول ختم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا، ربٰو کا مرتکب' اسلامی مملکت کے اس نظام کے علی الرغم دوسرا نظام قائم کرنا چاہتا ہے اور ظاہر ہے کہ مملکت کے نظام کے خلاف دوسرا نظام قائم کرنا کھلی ہوئی بغاوت ہے۔ اس لئے اسے " خدا اور رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ " سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لہٰذا، قرآنی مملکت میں ایسا نظام جس میں سرمایہ کا معاوضہ لیا جائے حرام ہی نہیں بلکہ مملکت کے خلاف بغاوت ہے۔ اس میں معاوضہ صرف محنت کا ہوگا، سرمایہ کا نہیں ہوگا۔ خواہ اس کی کوئی شکل ہو۔ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (۵۳/۳۹)۔ یعنی انسان صرف اس کا حقدار ہے جس کے لئے وہ محنت کرے۔ اس کے نظام کا بنیادی اصول ہے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ جب سرمایہ پر کچھ وصول ہی نہیں کیا جا سکے گا تو فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) کی، جو نظامِ سرمایہ داری کی اصل و بنیاد ہے کوئی قیمت ہی نہیں رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ضرورت سے زیادہ سب کچھ دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دے دینے کا حکم دیا ہے۔ یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹) تم سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کے لئے کھلا رکھیں۔ ان سے کہدو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زیادہ ہے، سب کا سب۔ اسی کی تفسیر رسول اللہؐ کی وہ حدیث کرتی ہے جس میں حضرت بلالؓ نے کہا ہے کہ

> رسول اللہؐ نے فرمایا کہ جو رزق تجھے عطا کیا گیا ہے اسے چھپا کر نہ رکھو۔ اور اس میں سے جو کچھ تجھ سے مانگا جائے اُسے مت روکو۔ میں نے کہا۔ یا رسول اللہؐ! یہ کیسے ممکن ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یا تو ایسا کرنا ہوگا یا جہنم کا ایندھن بننا پڑے گا۔ (حاکم)

دولت کی تقسیم

اس وقت دنیا میں اشتراکی نظام (کمیونزم) کا بڑا شہرہ ہے۔ اس نظام کا سنگِ بنیاد یہ اصول بتایا جاتا ہے۔

FROM EACH ACCORDING TO HIS CAPACITY
TO EACH ACCORDING. TO HIS NEEDS.

یعنی ہر شخص سے اس کی استعداد کے مطابق کام لیا جائے اور اس کی ضروریات کے مطابق اسے دیا جائے۔
اشتراکیت کا یہ اصول اس وقت تک محض ایک نظری اصول ہی ہے۔ اس پر عمل کہیں نہیں ہو رہا۔ جن ممالک کو اس وقت کمیونسٹ کہا جاتا ہے ان میں بھی کمیونزم کا نظام رائج نہیں۔ سوشلزم کا نظام رائج ہے۔ اس لئے ہنوز کمیونزم کا مندرجہ بالا اصول شرمندۂ معنی نہیں ہوا۔ لیکن اس اصول پر آج سے چودہ سو سال پہلے جہاں کی قرآنی مملکت میں عمل بھی ہو چکا ہے۔ اس میں شروع میں مالِ غنیمت کی تقسیم ہوتی تھی تو اس تقسیم میں رسول اللہ کا دستور یہ تھا کہ آپ غیر شادی شدہ کو ایک حصّہ دیتے تھے اور شادی شدہ کو دو گنا حصّہ۔ کیونکہ اس کی ضروریات زیادہ ہوتی تھیں۔ اس کے بعد جب افرادِ مملکت کے وظائف مقرر کر دیئے گئے تو ان میں بھی یہی اصول کارفرما رکھا گیا۔ یہ اس لئے کہ تمام افرادِ معاشرہ کو رزق ـــــ یعنی سامانِ زیست ـــــ مہیا کرنا اس مملکت کا فریضہ تھا۔ اس میں کوئی دوسرا اصول نافذ العمل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس مملکت نے ایسا معاشرہ قائم کرنا تھا جس میں کیفیت یہ ہو کہ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى۔ وَ (اَنَّكَ) لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى۔ (۲۰/۱۱۸-۱۱۹)۔ نہ کوئی شخص بھوک اور پیاس کی وجہ سے پریشان ہو اور نہ ہی وہ لباس اور مکان سے محروم رہے۔ یہ ہر فرد کی کم از کم بنیادی ضروریاتِ زندگی ہیں جن سے قرآنی مملکت میں کوئی بھی محروم نہیں رہ سکتا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس معاشرہ میں صرف انہی بنیادی ضروریات پر اکتفا کیا جاتا ہے اور دیگر سامانِ آسائش و زیبائش سے محرومی ہوتی ہے۔ جوں جوں اس معاشرہ میں ترقی ہوتی جاتی ہے اس کا نقشہ جنتی بنتا جاتا ہے جس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ـــــ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ (۲۲/۲۳)۔ نہایت اعلیٰ درجہ کے ریشمی ملبوسات۔ ثِيَابُ خُضْرٌ مِّنْ سُنْدُسٍ وَّ اِسْتَبْرَقٍ۔ (۱۸/۳۱) دبیز و لطیف ریشم کے زرکار پردے۔ سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ۔ مرصع اور نرم و نازک صوفے۔ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّ اَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا (۷۶/۱۵) چاندی کے برتن اور بلوریں آبخورے۔ غرضیکہ نَعِيْمًا وَّ مُلْكًا كَبِيْرًا (۷۶/۲۰)۔ عظیم مملکت اور اس میں سامانِ آسائش نہایت فراواں۔ اور پھر یہ سامانِ آسائش و آرائش کسی خاص طبقہ کے لئے مخصوص نہیں ہوگا۔ بلکہ ہر فردِ معاشرہ کے لئے یکساں۔ قرآن میں آپ شروع سے آخیر تک دیکھ جایئے۔ اس میں کہیں یہ نہیں لکھا ملے گا کہ جنتی زندگی کی یہ آسائشیں ایک خاص طبقہ کے لئے ہوں گی اور عوام ان سے محروم رہیں گے۔ قرآنی مملکت کے جنتی معاشرہ میں یہ تمام سامان ہر ایک کو میسّر ہوگا۔ اس میں سب کا معیارِ زندگی اتنا بلند ہوگا۔ جنت کا کوئی گوشہ جہنم نہیں ہو سکتا۔

دنیا میں آپ تمام اخلاقی برائیوں پر غور کیجئے۔ ان کے اولین سرچشمے دو ہی نظر آئیں گے۔ یعنی افراطِ زر یا افلاس و نکبت۔ افراطِ زر سے سرکشی و طغیانی کے فساد انگیز مظاہر ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اور نکبت و افلاس سے پستی و دنائت کے انسانیت کش عیوب و رذائل۔ جب قرآنی مملکت کے جنتی معاشرہ میں نہ افراطِ زر ہوگا نہ افلاس و زبوں حالی، تو ظاہر ہے کہ اس میں ان سے پیدا ہونے والے عیوب و رذائل کا بھی وجود نہیں ہوگا۔ حسد، کینہ، انتقام، تنگ نظری، حرص، ہوس، فریب کاریاں، مکاریاں، سازشیں ـــــ اور دوسری طرف بے حمیتی، بے غیرتی، ذلتِ نفس، تملق، خوشامد، منافقت وغیرہ۔ یہ سب عیوب معاشرتی ناہمواریوں کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ جب یہ ناہمواریاں

صلہ: روس اور چین اب پلٹ کر نظامِ سرمایہ داری کی طرف آ رہے ہیں۔

مٹ جائیں تو ان وجہ ننگِ انسانیت بدنہادیوں اور بدلگامیوں کا بھی وجود باقی نہیں رہتا۔ اس معاشرہ کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا تَأْثِيمًا۔ اس میں نہ لغویت اور بیہودہ پن ہوتا ہے، نہ کوئی ایسی حرکت جس سے کسی کے دل میں افسردگی و اضمحلال پیدا ہو۔ إِلَّا قِيلًا سَلَامًا سَلَامًا (۵۶/۲۵-۲۶) اس میں ہر طرف سے سلامتی کو نشیدِ دلنواز و آہنگِ روح افروز سنائی دیتی ہے۔ وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ (۷/۴۳)۔ ان کے سینے تمام ایسی کثافتوں سے پاک و صاف ہوں گے جنہیں انسان، غلط معاشرہ میں دل میں چھپائے رکھتا ہے۔ اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہوگی جسے ایک دوسرے سے چھپانے کی ضرورت پڑے۔ تکریمِ انسانیت اور احترامِ آدمیت وہاں کا عام اندازِ نگاہ ہوگا۔ وہاں نہ کوئی کسی کو ذلیل سمجھے گا نہ ذلیل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس معاشرہ کا انداز وہ ہوگا جس کا نقشہ اقبالؒ نے (جاوید نامہ میں) ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ ؎

ساکنانش در سخن شیریں چو نوش
خوبرو و نرم خوی و سادہ پوش

فکرشاں بے دردِ سوز اکتساب | راز دانِ کیمیائے آفتاب!
کس ز دینار و درم آگاہ نیست | ایں بتاں را در حرم ہا راہ نیست
خدمت آمد مقصدِ علم و ہنر | کار ہا کس نمی سنجد بزر
تحت کش دہقاں چراغش روشن است | از نہابِ دہ خدایاں ایمن است
کشت و کارش بے نزاعِ آبجو | حاصلش بے شرکتِ غیرے از دست
اندراں عالم نہ لشکر نہ قشوں | نے کسے روزی خورد از کشت و خوں
نے قلم در مرعدیں گیرد فروغ | از فنِ تحریر و تشہیر دروغ

نے بہ بازاراں ز بے کاراں خروش
نے صداہائے گدایاں در دو گوش

آخر میں اقبالؒ نے اس تمام تفصیل کو ایک شعر میں اس طرح سمٹا دیا ہے کہ اس کے بعد اس سلسلہ میں کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ یعنی قرآنی مملکت وہ ہے کہ ؎

کس دراں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

إِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ (۲۱/۹۲)۔ اوپر ایک خدا جس کی اطاعت کا قلادہ سب کے گلو اور نیچے ساری امت ایک صف میں دوش بدوش ایستادہ۔ نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِّي مِن دُونِ اللَّهِ (۳/۷۹)۔ اس میں کسی انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا خواہ اسے ضابطۂ قوانین اور حکومت، حتیٰ کہ نبوت بھی کیوں نہ مل جائے کہ وہ لوگوں کو اپنا محکوم بنائے اور ظاہر ہے کہ کسی کو محکوم بنانے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اسے محتاج بنا دیا جائے۔ جب قرآنی مملکت میں کوئی کسی کا محتاج نہیں ہوگا تو وہ کسی کا محکوم کس طرح سے ہوگا۔

اس قرآنی معاشرہ کی تشکیل کی ابتداء خود ارباب نظم ونسق کی طرف سے ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ کا یہ قول، قولِ فیصل کا حکم رکھتا ہے کہ

اگر میں پیٹ بھر کر کھڑا ہو جاؤں اور دیگر افرادِ معاشرہ بھوکے ہوں تو اس کے ایک ہی معنی ہیں کہ میں عوام کا اچھا رکھوالا نہیں ہوں۔ خدا کی قسم! اگر دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوکا مر جائے تو عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔

اور حضور نبی اکرمؐ کا یہ ارشادِ گرامی کہ

جس بستی میں کسی ایک شخص نے بھی رات بھوکے بسر کی تو اس بستی سے خدا کی حفاظت کا ذمہ ختم ہو جاتا ہے۔

اسی لئے قرآنی مملکت کا ایک قانون یہ بھی ہے کہ اگر کسی بستی میں کوئی شخص بھوک سے مر جائے تو اس بستی کے باشندوں کو اس کا قاتل سمجھا جاتا ہے اور ان سے اس کا خون بہا وصول کیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ قرآنی مملکت کا یہ نظام اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے اور بحسن وخوبی چل سکتا ہے، جب اس کے عمال (کارندے) دیانتدار اور قابل ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ بار بار اس قسم کی تاکیدی ہدایات جاری کرتے رہتے تھے کہ

یاد رکھو! جس شخص کے سپرد امت کا کوئی اقتدار ہوا، اور پھر اس نے قابلیت کے بجائے اپنی محبت یا قرابت کی بنا پر کسی کو مسلمانوں کا حاکم بنا دیا تو اس نے اللہ اور اس کے رسولؐ اور مسلمانوں سے غداری کی۔

اس باب میں ان کی احتیاط کا کیا عالم تھا، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ انہیں ولایت کوفہ کے لئے ایک خاص ٹائپ کے کارکن کی ضرورت تھی جو بسیار کوشش کے باوجود مل نہیں رہا تھا۔ ایک شخص نے ان سے کہا کہ میں ایک ایسے آدمی کو جانتا ہوں جو ان خوبیوں کا مالک ہے، آپ اسے منتخب کر لیں۔ آپ نے پوچھا کہ وہ کون ہے؟ اس نے کہا کہ آپ کا بیٹا ــــ عبداللہ ــــ یہ سنکر انہوں نے کہا کہ قاتلك الله۔ خدا تجھے غارت کرے۔ تو مجھے یہ کس قسم کا مشورہ دے رہا ہے؟ عبداللہ ابن عمرؓ بیشک ان خوبیوں کے مالک تھے۔ لیکن حضرت عمرؓ کو اس کا احساس تھا کہ اگر اس کی طرح پڑ گئی تو اس کا انجام کس قدر تباہ کن ہوگا۔ مملکت کے مناصب ارباب اقتدار کے اعزہ واقارب میں بٹنے لگ جائیں گے۔ وہ عمالِ حکومت کو تاکیداً لکھتے رہتے تھے کہ

سخت کوشی کی زندگی بسر کرنے کے عادی بنو۔ موٹا جھوٹا کھاؤ، گاڑھا گزی پہنو، پرانے کپڑے استعمال کرو۔ سواریوں کو خوب چارہ دو۔ ڈٹ کر گھوڑے کی سواری کرو اور جم کر تیر اندازی کرو۔

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ میں جو ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور میں حکومت کا کوئی کارندہ بد دیانت اور رشوت خور نہیں تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس قسم کے معاشی نظام میں کسی کو بد دیانت بننے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ بد دیانتی اور رشوت خوری کی ابتداء تو اس سے ہوتی ہے کہ حکومت کے ملازمین کو اپنے مستقبل کے متعلق ہمیشہ دھڑکا لگا رہتا ہے۔ یہ عدمِ تحفظ (INSECURITY) کا احساس اور خدشہ ہے جو انہیں زیادہ سے زیادہ سمیٹنے کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ اس کی ابتداء تو اس سے ہوتی ہے اور اس کے بعد زراندوزی کی ہوس انہیں آگے ہی آگے لئے چلی جاتی ہے۔ قرآنی مملکت کے نظام میں عدمِ تحفظ کا خیال تک نہیں پیدا ہو سکتا۔ اس میں تمام افرادِ مملکت اور ان کے بچوں کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری مملکت پر ہوتی ہے۔ اس لئے کسی کو اس کی فکر ہی نہیں ہوتی کہ کل کو میرا یا میرے بیوی بچوں کا کیا بنے گا۔

اور نہ ہی اس میں جائداد میں کھڑی کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس نظام میں کوئی شخص بددیانت ہو نہیں سکتا۔ اسے بددیانت ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

مجیر العقول کارنامے

اگلے دنوں میرے ایک فوجی دوست نے مجھ سے پوچھا کہ قرنِ اوّل میں مسلمان سپاہیوں (مجاہدین) نے جو مجیر العقول کارنامے کر دکھائے، اس کی بنیادی وجہ کیا تھی؟ میں نے کہا کہ ذرا اس پر غور کیجئے کہ وہ کون سے اسباب و احساسات ہیں جن کی وجہ سے ایک سپاہی میدانِ جنگ سے بھاگ جاتا یا کمزوری دکھاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں پہلا احساس یہ ہوتا ہے کہ میں مر جاؤں گا۔ اور دوسرا احساس یہ کہ میرے بعد میرے بیوی بچوں کا کیا بنے گا؟ وہ تباہ ہو جائیں گے۔ قرآن نے یہ تصور دیا کہ موت صرف نقلِ مکانی کا نام ہے۔ کوئی انسان موت سے ختم نہیں ہو جاتا۔ وہ زندہ رہتا ہے۔ بس صرف مکان کی تبدیلی ہوتی ہے۔ (اسی لئے ہمارے ہاں موت کے لئے انتقال کا لفظ رائج تھا جو اس تصور کی ٹھیک ترجمانی کرتا تھا)۔ مسلمان سپاہی کے دل میں یہ تصورِ ایمان کی حیثیت لئے ہوتا ہے اس لئے اُسے موت کا ڈر ہی نہیں ہوتا۔ باقی رہا یہ دھڑکا کہ میرے مرنے کے بعد میری بیوی بچوں کا کیا ہوگا تو اس کی ذمہ داری پہلے ہی سے مملکت نے لے رکھی ہوتی ہے۔ لہٰذا، اسے یہ غم بھی نہیں ستاتا۔ اب سوچئے کہ جس سپاہی کو نہ موت کا ڈر ہو اور نہ ہی اپنے پسماندگان کے مستقبل کی طرف سے کسی قسم کا تردد۔ اس کے زورِ بازو کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ اس کی تو نگاہ سے (اقبالؒ کے الفاظ میں) تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کو اگر روٹی کی فکر سے آزاد کر دیا جائے تو وہ "جنّ" بن جاتا ہے۔ اس کی وہ صلاحیتیں جو اس سے پہلے چکی کے اس پاٹ (MILL - STONE) کے نیچے بُری طرح سے دبی اور کچلی رہتی ہیں، اس طرح اُبھر کر باہر آتی ہیں کہ وہ کچھ اور کی اور مخلوق بن جاتا ہے۔ وہ صحیح انسانی پیکر میں سامنے آتا ہے۔ اس کی عظمتِ انسانیت چھلک کر باہر آجاتی ہے۔ اس کی ممکناتِ زندگی ایک ایک کر کے محسوس پیکر اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ، وہ کچھ کر کے دکھا دیتا ہے جسے عام سطح کا انسان معجزات اور کرامات سمجھتا ہے۔ حالانکہ وہ نہ کوئی معجزہ ہوتا ہے نہ کرامت۔ روٹی کے چکّر میں پھنسا ہوا انسان، کبھی انسانی سطح پر نہیں آسکتا۔ اسے کسی انسانی مسئلہ کی طرف دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے جو قرآن کریم نے حضراتِ انبیاء کرامؑ سے کہا کہ

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا (۲۳/۵۱)

اے ہمارے رسولو! خوشگوار رزق کھاؤ اور اعمالِ صالح کرو۔

آپ نے غور فرمایا کہ اعمالِ صالح اور روٹی کا کس طرح چولی دامن کا ساتھ ہے۔ میں تو کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ یہ جو ہمارے ہاں ایک مذہبی افسانہ مشہور ہے کہ ابلیس نے آدم کو دانۂ گندم کھلا دیا جس سے وہ جنّت سے باہر نکال دیا گیا تو اس سے کسی سیانے نے اسی طرف اشارہ تو نہیں کیا کہ انسان کو جنت سے نکلوانا مقصود ہو تو اسے روٹی کی فکر میں الجھا دو۔ اس کی تائید خود قرآن سے بھی ہوتی ہے۔ اس نے قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں بتایا ہے کہ آدم جس جنّت میں رہتا تھا وہاں اسے روٹی کی کوئی فکر نہیں تھی۔ وہاں اس کی کیفیت یہ تھی کہ — وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (۲/۳۵) وہ جہاں سے جی چاہتا پیٹ بھر کر کھا لیتا۔ اس سے کہا گیا کہ یاد رکھو! اگر تم ابلیس کے فریب میں آ گئے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقَىٰ (۲۰/۱۱۷)۔ تو وہ تمہیں اس جنتی زندگی سے نکلوا دے گا۔ اور تمہیں

اسی روٹی کی خاطر جگر پاش مشقتیں اٹھانی پڑیں گی۔ انسان اس کے فریب میں آگیا۔ جس کا نتیجہ سرمایہ دارانہ نظام تھا۔ اس سے بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (۲۰/۱۲۳)۔ کی انسانیت سوز جہنم وجود میں آگئی جس میں ہر فرد کا مفاد دوسرے فرد کے مفاد سے ٹکرانے لگا۔ انسان کو اس جہنم سے نکالنے کے لئے، آسمانی راہنمائی کا سلسلہ شروع ہوا۔

بعثت نبی اکرمؐ کا مقصد

قرآن کریم نے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد یہ بتایا ہے کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷/۱۵۷)۔ یہ ان زنجیروں کو توڑ ڈالے گا۔ جن میں انسانیت جکڑی ہوئی تھی اور اُس کے سر سے ان سلوں کو اتار پھینکے گا جن کے نیچے وہ بُری طرح دبی ہوئی تھی۔ ان زنجیروں میں سب سے زیادہ کڑی اور ان سلوں میں سب سے زیادہ بوجھل، وہ خوف و ہراس تھا جو "روحانی" قوتوں کے نام سے انسان کے اعصاب پر سوار چلا آرہا تھا۔ اس سے اس میں جس قسم کی نفسیاتی الجھنیں (COMPLEXES) پیدا ہوتی تھیں۔ ہماری علمی دنیا اب اُن سے اچھی طرح روشناس ہو چکی ہے۔ قرآن کریم نے ختمِ نبوت[1] کے اعلان سے اس سارے بوجھ کو الگ کر کے رکھ دیا۔ اس نے کہا کہ اب کوئی انسان کسی دوسرے انسان سے آکر یہ نہیں کہہ سکے گا کہ میں آسمان سے آیا ہوں اور تم زمینی مخلوق ہو۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر کہ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ اس باب میں سبقت کی۔

اب کوئی مافوق الفطرت عنصر، یا جسے عام طور پر روحانی قوت کہا جاتا ہے۔ انسانی زندگی پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ اس سے انسانی صلاحیتوں کو ابھرنے اور نشوونما پانے کا کُلی امکان حاصل ہو گیا۔ اور انسان کو پرکھنے کا معیار، شرفِ انسانیت (یعنی اس کی انسانی صلاحیتوں کی سطح) قرار پا گیا۔ اس حقیقت کو قرآنی معاشرہ کے ارباب فکر و عمل کیسے اچھی طرح سمجھے ہوئے تھے، اس کا اندازہ حضرت عمرؓ کے پیش کردہ اس معیار سے لگائیے جو ہمیں تاریخ کے صفحات میں محفوظ ملتا ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ایک دفعہ کوئی شخص آپ کے سامنے کسی مقدمہ میں پیش ہوا۔ آپ نے اس سے کہا کہ تم کسی ایسے آدمی کو لاؤ جو تمہیں اچھی طرح جانتا ہو۔ وہ ایک آدمی کو لایا۔ حضرت عمرؓ نے اس سے پوچھا کہ کیا تم اس شخص کو اچھی طرح جانتے ہو۔ اس نے کہا، ہاں۔ تو آپ نے پوچھا کہ کیا تم کبھی اس کے پڑوس میں رہے ہو؟ اور اس کی اندر باہر کی زندگی سے واقف ہو۔ اس نے نفی میں جواب دیا۔ تو آپ نے کہا کہ تم نے کبھی اس کے ساتھ سفر کیا ہے، اس کا جواب بھی نفی میں ملا۔ تو آپ نے کہا کہ کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ لین دین کا معاملہ کیا ہے؟ اس نے اس سے بھی انکار کیا تو حضرت عمرؓ نے جو کچھ فرمایا وہ اس نکتہ کی اچھی طرح حقیقت کشائی کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ

پھر یوں نظر آتا ہے کہ تم نے اسے مسجد میں کھڑے کبھی سر جھکاتے اور سر اوپر اٹھاتے ہی دیکھا ہے۔

اس نے اقرار کیا تو آپ نے کہا کہ "چلے جاؤ۔ تم اسے خاک نہیں جانتے"۔ اور اس شخص سے کہا کہ تم کسی ایسے آدمی کو لاؤ جو تمہیں انسان

---

[1] ختمِ نبوت کے بعد "آسمانی آواز" قرآن کے اندر محفوظ ہے۔ جو قیامت تک تمام نوعِ انسانی کے لئے مکمل ضابطۂ ہدایت ہے۔ اس کے علاوہ اب کوئی خدائی اتھارٹی نہیں بن سکتا۔

کی حیثیت سے جانتا ہو۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم کی عطا فرمودہ نئی اقدار اور نبی اکرمؐ کے عدیم المثال عمل نے، انسانیت کے ماپنے کے کس قدر نئے پیمانے عطا کر دیئے تھے۔ یہ وہ پیمانے تھے جن کی رُو سے انسان کی قدر و قیمت اس کی انسانی صلاحیتوں کی بنا پر متعین ہوتی تھی۔ اور ان صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقعہ ان اقدار کی رُو سے ملتا تھا۔

نہ خوف نہ حُزن

وہ دوسری سلیں جنہوں نے انسان کو بُھس کی طرح کچل رکھا تھا، چکی کے پاٹ تھے یعنی روٹی کی فکر — قرآنی مملکت نے انسان کو اس فکر سے آزاد کر کے، اس محبوس قفس طائر لاہوتی کو آزادی کی حقیقی فضاؤں میں اِذنِ بال کشائی دے دیا جس سے اُسے اپنی منزل آسمانوں میں نظر آنے لگی۔ قرآن کریم نے قرآنی مملکت کی خصوصیتِ کبریٰ یہ بتائی ہے کہ اس میں افرادِ معاشرہ کی کیفیت یہ ہوگی کہ — لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ انہیں کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حُزن۔ یعنی وہ ہر قسم کے خوف اور حُزن سے مامون ہوں گے۔ خوف کے معنی تو ہم سمجھتے ہیں — کسی آنے والے خطرہ کے احساس سے ہراساں — قرآنی مملکت میں کس قدر بے خوفی اور امن ہوتا ہے، اس کے متعلق نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میں ایسا نظام قائم کروں گا جس میں حالت یہ ہوگی کہ یمن سے ایک عورت تنہا، صحراؤں اور بیابانوں سے سفر کرتی ہوئی شام تک چلی جائے گی اور اسے کسی قسم کا خطرہ نہیں ہوگا — بے خوفی اور امن کے ماپنے کا اس سے بہتر پیمانہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ باقی رہا وہ خوف جو زیردستوں کو بالا دستوں کی طرف سے ہر وقت وجۂ سوہانِ روح ہوتا ہے، سو اس کے متعلق وہ واقعہ سامنے لایئے کہ حضرت عمرؓ ایک دفعہ ایک وادی میں سے گزر رہے تھے کہ آپ نے یکایک سواری کو روکا، نیچے اترے اور سجدے میں گر گئے۔ رفقاء نے پوچھا کہ آپ نے یہ کیا کیا تو فرمایا کہ یہ وہ وادی ہے جس میں عمرؓ اپنے باپ کے اونٹ چرایا کرتا تھا۔ اور سہمے سہمے پھرا کرتا تھا۔ باپ بھی سخت تھا اور یونہی بات بات پر پیٹ دیا کرتا تھا۔ ایک وہ دن تھا، اور ایک یہ دن ہے کہ عمرؓ اور اس کے خدا کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں جس سے ڈرا جائے۔ یہ وادی دیکھ کر مجھے یہ احساس اس شدت سے ہوا کہ میں بے اختیار بحضور رب العزت سجدہ میں گر گیا۔

یہ ہوتا ہے قرآنی مملکت میں بے خوفی کا عالم۔ اس میں، خدا اور بندے کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں ہوتی جس سے ڈرا جائے۔ اور خدا کا ڈر بھی کسی مستبد حاکم کا ڈر نہیں ہوتا۔ خدا کے ڈر سے مراد ہوتا ہے اس نقصان اور تباہی کا احساس جو قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ مثلاً جس طرح ہم دریا کے کنارے چلتے ہوئے، پاؤں پھسلنے کے انجام سے ڈرتے ہیں — قرآنی مملکت میں قانون شکنی کے نقصان رساں نتائج کے احساس کے سوا کسی قسم کا خوف کسی کو نہیں ستاتا۔

باقی رہا حُزن، تو یہ لفظ بڑے گہرے معانی کا حامل ہے۔ عام طور پر اس کے معنی افسردگی اور اندوہناکی ہوتے ہیں۔ خواہ اس کی وجہ کچھ بھی ہو۔ لیکن اسے بالخصوص اس افسردگی اور غمگینی کے لئے بولا جاتا ہے جو معاشی پریشانی کی وجہ سے حائل ہو۔ سورۂ فاطر میں جنتی معاشرہ میں بسنے والوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان کی زبان پر بے ساختہ یہ الفاظ آئیں گے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ۔ کس قدر قابل حمد و ستائش ہے خدا کا وہ نظام جس نے ہمیں حُزن سے نجات دلائی۔ عربی زبان کے مستند لغت تاج العروس میں لکھا ہے کہ یہاں حُزن کے معنی ہیں صبح و شام کے کھانے کی فکر۔ اس کی تشریح خود اگلی آیت نے کر دی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اَلَّذِیْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ

کی حیثیت سے جانتا ہو۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم کی عطا فرمودہ نئی اقدار اور نبی اکرمؐ کے عدیم المثال عمل نے، انسانیت کے ماپنے کے کس قدر نئے پیمانے عطا کر دیئے تھے۔ یہ وہ پیمانے تھے جن کی رُو سے انسان کی قدر و قیمت اس کی انسانی صلاحیتوں کی بنا پر متعین ہوتی تھی۔ اور ان صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقعہ ان اقدار کی رُو سے ملتا تھا۔

نہ خوف نہ حُزن

وہ دوسری سلیں جنہوں نے انسان کو بُھس کی طرح کچل رکھا تھا، چکی کے پاٹ تھے یعنی روٹی کی فکر ـــ قرآنی مملکت نے انسان کو اس فکر سے آزاد کر کے، اس مجبورِ قفس طائرِ لاہوتی کو آزادی کی حقیقی فضاؤں میں اذنِ بال کشائی دے دیا جس سے اُسے اپنی منزل آسمانوں میں نظر آنے لگی۔ قرآن کریم نے قرآنی مملکت کی خصوصیتِ کبریٰ یہ بتائی ہے کہ اس میں افرادِ معاشرہ کی کیفیت یہ ہوگی کہ ـــ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ انہیں کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حُزن۔ یعنی وہ ہر قسم کے خوف اور حُزن سے مامون ہوں گے۔ خوف کے معنی تو ہم سمجھتے ہیں ـــ کسی آنے والے خطرے کے احساس سے ہراساں ـــ قرآنی مملکت میں کس قدر بے خوفی اور امن ہوتا ہے؟ اس کے متعلق نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میں ایسا نظام قائم کروں گا جس میں حالت یہ ہوگی کہ یمن سے ایک عورت تنہا، صحراؤں اور بیابانوں سے سفر کرتی ہوئی شام تک چلی جائے گی اور اسے کسی قسم کا خطرہ نہیں ہوگا ـــ بے خوفی اور امن کے ماپنے کا اس سے بہتر پیمانہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ باقی رہا وہ خوف جو زیردستوں کو بالادستوں کی طرف سے ہر وقت وجہِ سوہانِ روح ہوتا ہے؟ سو اس کے متعلق وہ واقعہ سامنے لایئے کہ حضرت عمرؓ ایک دفعہ ایک وادی میں سے گزر رہے تھے کہ آپ نے یکایک سواری کو روکا، نیچے اترے اور سجدے میں گر گئے۔ رفقاء نے پوچھا کہ آپ نے یہ کیا کیا تو فرمایا کہ یہ وہ وادی ہے جس میں عمرؓ اپنے باپ کے اونٹ چرایا کرتا تھا۔ اور سہمے سہمے پھرا کرتا تھا۔ باپ بھی سخت تھا اور یونہی بات بات پر پیٹ دیا کرتا تھا۔ ایک وہ دن تھا، اور ایک یہ دن ہے کہ عمرؓ اور اس کے خدا کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں جس سے ڈرا جائے۔ یہ وادی دیکھ کر مجھے یہ احساس اس شدت سے ہوا کہ میں بے اختیار بحضور رب العزت سجدہ میں گر گیا۔

یہ ہوتا ہے قرآنی مملکت میں بے خوفی کا عالم۔ اس میں، خدا اور بندے کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں ہوتی جس سے ڈرا جائے۔ اور خدا کا ڈر بھی کسی مستبد حاکم کا ڈر نہیں ہوتا۔ خدا کے ڈر سے مراد ہوتا ہے اس نقصان اور تباہی کا احساس جو قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ مثلاً جس طرح ہم دریا کے کنارے چلتے ہوئے، پاؤں پھسلنے کے انجام سے ڈرتے ہیں ـــ قرآنی مملکت میں قانون شکنی کے نقصان رساں نتائج کے احساس کے سوا کسی قسم کا خوف کسی کو نہیں ستاتا۔

باقی رہا حُزن، تو یہ لفظ بڑے گہرے معانی کا حامل ہے۔ عام طور پر اس کے معنی افسردگی اور اندوہناکی ہوتے ہیں۔ خواہ اس کی وجہ کچھ بھی ہو۔ لیکن اسے بالخصوص اس افسردگی اور غمگینی کے لئے بولا جاتا ہے جو معاشی پریشانی کی وجہ سے حائل ہو۔ سورۂ فاطر میں جنتی معاشرہ میں بسنے والوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان کی زبان پر بے ساختہ یہ الفاظ آئیں گے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ۔ کس قدر قابل حمد و ستائش ہے خدا کا وہ نظام جس نے ہمیں حُزن سے نجات دلائی۔ عربی زبان کے مستند لغت، تاج العروس میں لکھا ہے کہ یہاں حُزن کے معنی ہیں صبح و شام کے کھانے کی فکر۔ اس کی تشریح خود اگلی آیت نے کر دی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اَلَّذِیْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد میری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

پاکستان، اسی عالم افروز اور انسانیت ساز تصور کا حسین و جمیل پیکر بننے کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔

لیکن

اور یہ "لیکن" ایک داستان ہے جگر گداز، اور ایک حدیث ہے دلخراش۔ اگر میں نے اسے بیان کرنا شروع کر دیا تو مجھے ڈر ہے کہ آپ یہ نہ کہہ دیں کہ ؎

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ بس آج کی شب بھی سو چکے ہم

اس لئے میں اس خواب رُبا قصہ کی تفصیل میں جانے کے بجائے اسے قرآن کے الفاظ میں کیوں نہ پیش کر دوں جن میں اختصار اور جامعیت معجزانہ حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ آپ سورۂ اعراف کی آیت ۱۷۵ سامنے لائیے جہاں سے بات کا آغاز اس طرح کیا گیا ہے کہ

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِي آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا فَانسَلَخَ (۷/۱۷۵)

تم انہیں اس شخص کی عبرت آموز داستان (تمثیلاً) سناؤ جسے ہم نے منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے تمام نشاناتِ راہ عطا کر دیئے تھے۔ لیکن وہ انہیں چھوڑ کر یوں الگ ہو گیا جیسے سانپ اپنی کینچلی سے نکل جاتا ہے کہ اس پر اس کا کوئی نشان تک باقی نہیں رہتا۔ ایسا اس لئے ہوا کہ وہ اپنے ذاتی مفادات کے حصول اور پست جذبات کی تسکین کے پیچھے لگ گیا۔ اور یوں راہ سے بے راہ رو ہو گیا۔

ہم چاہتے تھے کہ وہ آسمان کی بلندیوں تک پہنچ جائے لیکن وہ زمین کی پستیوں کے ساتھ چپک کر رہ گیا۔ انفرادی مفاد پرستیوں کا نتیجہ یہی ہوا کرتا ہے۔ ان ہوسناکیوں سے اس کی مثال کتے کی سی ہو گئی کہ اسے اکساؤ اور دوڑاؤ تو بھی وہ ہانپے اور زبان لٹکائے اور ویسے چھوڑ دو تو بھی ہانپے اور زبان لٹکائے۔ اس کا ہوکا کسی صورت میں کم ہی نہ ہو۔

ذَٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا — یہ حالت ہو جاتی ہے اس قوم کی جو ہمارے قوانین کا زبانی اقرار تو کرتی ہے لیکن عملاً انہیں جھٹلاتی ہے — فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ — تم انہیں ان کی یہ داستان سناؤ۔ شاید یہ اس پر غور و فکر کریں اور سوچیں ہمارا ایسا حال کیوں ہو گیا؟ سَاءَ مَثَلًا الْقَوْمُ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا۔ آپ! کس قدر بُری حالت ہو جاتی ہے اس قوم کی جو ہمارے قوانین کی عملاً تکذیب کرتی ہے۔ اس میں ہر ظلم و زیادتی کرنے والا سمجھتا ہے کہ میں دوسروں کو لوٹ کر اپنا فائدہ کر رہا ہوں لیکن نہیں سوچتا کہ — وَأَنفُسَهُمْ كَانُوا يَظْلِمُونَ (۷/۱۷۷) — وہ اس طرح کسی دوسرے کا نہیں خود اپنا ہی نقصان کر رہا ہے۔ جذبات پرستی کے طوفان میں غرق ہونے سے ان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا۔ وہ سینے میں دل۔ رکھتے ہیں لیکن ان سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔ وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا۔ وہ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا۔ ان کے کان بھی ہوتے ہیں لیکن انہیں کچھ سنائی نہیں دیتا۔ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ۔ تم انہیں انسان سمجھتے ہو؟ نہیں۔ یہ انسان نہیں، حیوان ہیں — بَلْ هُمْ أَضَلُّ۔ نہیں! یہ تو ان سے بھی گئے گزرے ہیں۔ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ (۷/۱۷۹)۔ حیوان اپنی زندگی کے تقاضوں سے کبھی غافل نہیں ہوتا۔ اور ان انسان نما حیوانوں کو خبر ہی نہیں کہ ان کی زندگی کے تقاضے کیا ہیں اور یہ کس طرف جا رہے ہیں ؎

کاروں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

(جنوری ۱۹۸۰ء)

فہرست معطیان قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی (۱۴ فروری ۱۹۸۰ء تا ۱۵ مارچ ۱۹۸۰ء)

اسمائے گرامی	رقم	رسید نمبر
محترم		
۱۔ ڈاکٹر بیدار رشید صاحب - مریدکے	۱۰۰/- روپے	۲۳۲۲
۲۔ معرفت بزم طلوع اسلام - لاہور	۱۳۰/-	۲۳۲۳، ۲۳۲۴، ۲۳۴۹، ۲۳۵۰
۳۔ محترمہ میر ابوبکر نواب صاحبہ معرفت سید علی قادری صاحب - بحرین	۵۰۰/-	۲۳۲۵
۴۔ بیگم نفیس قاضی صاحبہ معرفت ایم اے لطیف صاحب - کراچی	۳،۰۰۰/-	۲۳۲۶
۵۔ مسٹر اے رشال صاحب معرفت مس آر خان صاحبہ - بحرین	۲۵۸/-	۲۳۲۷
۶۔ معرفت بزم طلوع اسلام - کراچی	۵۴۰۰/-	۲۳۲۸ تا ۲۳۴۲
۷۔ ماسٹر وارنٹ آفیسر ناصر حسین صاحب - بھوپالوالہ	۲۵/-	۲۳۴۳
۸۔ محمد صدیق نظامانی صاحب - کراچی	۵۰۰/-	۲۳۴۴
۹۔ جلم جیت ملک صاحب - پھلروان	۱۰/-	۲۳۴۵
۱۰۔ بیگم شہزادہ راحیل عظمت صاحبہ - گوجرانوالہ	۲۵/-	۲۳۴۶
۱۱۔ فضل کریم صاحب - مردان	۱۰۰/-	۲۳۴۷
۱۲۔ سید عبدالستار شاہ صاحب - کنڈیاں	۵۰/-	۲۳۴۸
۱۳۔ ڈاکٹر حسن اے چیاوڑ صاحبہ - راولپنڈی	۱۰۰/-	۲۳۵۱
۱۴۔ جان محمد ایس بمعہ ظفر باشاری صاحب - پڑعیدن	۱۰۰/-	۲۳۵۲
۱۵۔ خان محمد صدیق خان صاحب معرفت عزیز سومرو صاحب - میاں چنوں	۱۰۰/-	۲۳۵۳
۱۶۔ معرفت بزم طلوع اسلام - لندن	۱۰،۶۷۳/-	۲۳۵۴ تا ۲۳۶۲
۱۷۔ گڑیا نمبر ۲ - چاپ سوکوارٹرز - کراچی کے احباب معرفت محمد رشید شبیہ صاحب - کراچی	۵۵/-	۲۳۶۳ تا ۲۳۷۱
۱۷۰۸۔ ایم ایم شکیل صاحب - جدہ	۲۰۰/-	۲۳۷۲
۱۸۔ عبدالعزیز نظامی صاحب - سرگودھا	۵۰۰/-	۲۳۷۳
۱۹۔ سید فضل حسین صاحب - تربیلا ڈیم	۵۰/-	۲۳۷۴
۲۰۔ محمد ارشاد صاحب - چاریان - مری	۲۵/-	۲۳۷۵
۲۱۔ علامہ مظفر عباسی صاحب - مری	۲۵/-	۲۳۷۶
۲۲۔ محمد رفیق شاہد صاحب - معرفت بزم طلوع اسلام - کمالیہ	۵۰۰/-	۲۳۷۷
۲۳۔ مسز ابو سعید صاحبہ معرفت خالد گل صاحب - سعودی عرب	۱،۰۰۰/-	۲۳۷۸
۲۴۔ عنایت اللہ خان (مرحوم) معرفت خدا بخش چوہدری صاحب - لندن	۳۰۰/-	۲۳۷۹

اسمائے گرامی	رقم	رسید نمبر
محترم		
۲۵۔ ملک محمد حنیف وجدانی صاحب - مری	۱۰۰/- روپے	۲۳۸۰
۲۶۔ مسز ظفر سعید صاحبہ - سیالکوٹ	۳۰/-	۲۳۸۱
۲۷۔ مسز نجمہ ڈار صاحبہ - اسلام آباد	۲۰۰/-	۲۳۸۲
۲۸۔ ایم اے رشید چوہدری صاحب - قطر	۲،۶۶۵/-	۲۳۸۳
۲۹۔ چوہدری عبدالکریم صاحب - ننکانہ صاحب	۵۰/-	۲۳۸۴
۳۰۔ معین صاحب ملک - اسلام آباد	۳۰۰/-	۲۳۸۵
۳۱۔ بریگیڈیئر ایم اے سلام صاحب - راولپنڈی	۲۵۰/-	۲۳۸۶
۳۲۔ معرفت بزم طلوع اسلام - برمنگھم	۱۸،۹۹۹/۷۸	۲۳۸۷ تا ۲۴۰۶
۳۳۔ طفیل محمد صاحب - شالامار ٹاؤن - لاہور	۵۰۰/-	۲۴۰۷
۳۴۔ اے آر صابر صاحب - ٹیکسلا	۵۰/-	۲۴۰۸
۳۵۔ نائیک محمد سعید صاحب - ونگ - لاہور چھاؤنی	۵۰/-	۲۴۰۹
۳۶۔ محمد صدیق صاحب - لاہور	۱۰۰/-	۲۴۱۰
۳۷۔ معرفت بزم طلوع اسلام - کراچی	۱۱،۸۵۰/-	۲۴۱۱ تا ۲۴۳۲
۳۸۔ غلام خان صاحب - خاکی - ضلع مانسہرہ	۱۰۰/-	۲۴۳۳
۳۹۔ عبدالمجید چغتائی صاحب - بنوں	۱۰۰/-	۲۴۳۴
۴۰۔ شفیق خالد صاحب - بحرین	۵۰۰/-	۲۴۳۵
۴۱۔ معرفت بزم طلوع اسلام - راولپنڈی	۴،۲۵۰/-	۲۴۳۶ تا ۲۴۴۱
۴۲۔ ملک عطاء اللہ صاحب - لاہور	۵۰/-	۲۴۴۲
۴۳۔ محمد یعقوب اختر صاحب - اسلام آباد	۵۰/-	۲۴۴۳
۴۴۔ محمد شمشیر صاحب - میرپور خاص	۱۰/-	۲۴۴۴
۴۵۔ صوبیدار عبدالمجید صاحب - بزم طلوع اسلام کمالیہ	۲،۶۰۰/-	۲۴۴۵
۴۶۔ معرفت بزم طلوع اسلام - پشاور	۸۲۰/-	۲۴۴۶ تا ۲۴۵۴
۴۷۔ معرفت بزم طلوع اسلام - کراچی	۳،۳۸۱/-	۲۴۵۵ تا ۲۴۶۹

میزان = ۷۱،۶۳۶/۲۸

سابقہ میزان = ۲۰،۲۳،۲۵۳/- + ۸۰۰ ڈالر کینیڈین

کل میزان = ۲۰،۹۴،۸۸۹/۲۸ + ۸۰۰ ڈالر کینیڈین

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

لاہور میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (فون ۸۸۰۸۰)
بی ۲۵ گلبرگ ۲ (نزد پولیس اسٹیشن)

بزمِ طلوعِ اسلام ہر ماہ کے پہلے اتوار کو ڈھائی بجے دوپہر (بذریعہ ٹیپ)
لندن (انگلینڈ)
145 BRITON COURT RD
LONDON E-13 - 9NR.
PHONE 01 - 552 - 1517

فیصل آباد میں ہر جمعہ ۳ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
حیات سرجری کلینک c/23 پیپلز کالونی I
(فون 27455)

کراچی میں ہر جمعہ کو ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) کتب خانہ
بزمِ طلوعِ اسلام۔ کمرہ نمبر ۲۴ ہارون چیمبرز
الطاف حسین روڈ۔ نیو چالی۔ کراچی ۲

گوجرانوالہ میں ہر جمعہ ۴ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) رہائش گاہ
چوہدری مقبول شوکت۔ گل روڈ سول لائنز
(بالمقابل پرانا ریلوے اسٹیشن)

پشاور میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) بر مکان آغا
محمد یونس صاحب۔ رفیقی لین صدر۔ بالمقابل وی آئی پی
مین گیٹ۔ پشاور سٹیڈیم۔ بارہ روڈ (فون ۴۲۵۹)

گجرات میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ نیز بروز اتوار ۴ بجے شام
بمقام ۱۲/۱/بی جمبر روڈ (بذریعہ ٹیپ)

مردان میں ہر جمعہ ۸ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
بر مکان ڈاکٹر رضا محمد خاں۔ نواب علی روڈ

جلالپور جٹاں میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ بذریعہ ٹیپ
دفتر بزمِ طلوعِ اسلام (بازار کلاں)

راولپنڈی میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
جی ۱۲۶۔ لیاقت روڈ

ملتان میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ)
دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ۔ (فون ۳۱۰۷۱)

لیہ (بذریعہ ٹیپ) ہر جمعہ بعد نماز مغرب
رہائش گاہ ڈاکٹر اظہر ملک صاحب سرکلر روڈ۔ لیہ

پنج کسی میں ہر جمعہ (بذریعہ ٹیپ) بوقت ۳ بجے شام
(تحصیل کبیر والا ضلع ملتان) بمقام مطب حکیم احمد الدین صاحب
نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام

ضرورت رشتہ

معزز متوسط خاندان کی تعلیم یافتہ دوشیزہ عمر ۲۵ سال۔ دراز قد۔ خوش شکل۔ امورِ خانہ داری میں ماہر۔ سلجھے ہوئے تعلیم یافتہ ماحول کی پروردہ کے لئے تعلیم یافتہ سلجھے ہوئے۔ روشن خیال اور وسیع النظر برسرِ روزگار لڑکے کا رشتہ درکار ہے۔ لڑکے کی عمر ۳۰ سال تک ہو۔ تمام تفاصیل پہلے ہی خط میں لکھ دینی چاہئیے

(ش۔ ب) معرفت ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲۔ لاہور

بتقریب یومِ اقبالؒ

اقبالؒ اور کمیونزم

ہمارے ہاں چونکہ نہ تحریکِ پاکستان کی کوئی مستند تاریخ ہے، نہ قائدِ اعظمؒ یا علامہ اقبالؒ کے قابلِ اعتماد سوانح حیات اس لئے فتنہ گروں کے لئے، الزام تراشیوں اور تہمت بافیوں کی سزا بڑی سازگار ہے۔ کبھی کہہ دیا جاتا ہے کہ تقسیم ہند کی اسکیم دراصل انگریز کی تخلیق تھی اور قائدِ اعظمؒ برطانیہ کے آلہ کار تھے۔ کبھی آواز اٹھتی ہے کہ قائدِ اعظمؒ پاکستان کو سیکولر اسٹیٹ بنانا چاہتے تھے۔ (اور اب تو خیر سے ایک بزرگوار نے اس موضوع پر ایک کتاب بھی شائع کر دی ہے.... یا للعجب!) دوسری طرف، علامہ اقبالؒ کے متعلق طرح طرح کی افواہیں پھیلائی جاتی ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا یہ آواز اٹھی کہ اقبالؒ کمیونسٹ تھا۔ طلوعِ اسلام نے اس کی بھرپور تردید کی تو یہ چنگاری خاموش ہو گئی لیکن معلوم ہوا کہ یہ دب گئی تھی، بجھی نہیں تھی۔ اس لئے کہ اب جو حادثۂ افغانستان کے سلسلہ میں کمیونسٹوں نے کروٹ لی ہے تو یہی فتنہ پھر بیدار کیا جا رہا ہے۔ یعنی یہ افواہ پھیلائی جا رہی ہے کہ اقبالؒ کمیونسٹ تھا۔ علامہ اقبالؒ زندہ ہوتے تو اس الزام کی تردید خود فرما دیتے۔ لیکن اب اس فریضہ کی ادائیگی طلوعِ اسلام کے ذمہ ہے جو فکرِ اقبالؒ کا پیامبر ہے۔ ان سطور کا محرک یہی جذبہ ہے۔ اقبالؒ کو کمیونسٹ کہنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ کہہ دے کہ اقبالؒ درحقیقت ہندو تھا اور اس کا.... اصلی نام اقبال چند تھا! ویسے، کسی کو کمیونسٹ کہہ دینا آسان بھی بڑا ہے۔ جہاں کسی نے کہا کہ ملک میں کوئی بھوکا نہیں رہنا چاہیئے، مشہور کر دیا کہ وہ کمیونسٹ ہے۔ آپ کو شاید معلوم ہو گا کہ خود طلوعِ اسلام کے خلاف بھی یہ فتوے صادر کیا گیا تھا کہ یہ کمیونسٹ ہے کیونکہ یہ کہتا ہے کہ قرآن کریم نظام سرمایہ داری کے خلاف ہے۔ بہرحال سرِدست بات اقبالؒ اور کمیونزم کی ہو رہی ہے اس لئے ہم اپنے رشحاتِ قلم کو یہیں تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔

ہم متعدد بار وضاحت سے لکھ چکے ہیں کہ کمیونزم (یا اس کا قدمِ اوّل، سوشلزم) ایک معاشی نظام ہی نہیں بلکہ ایک فلسفۂ زندگی اور نظریۂ حیات ہے جس کی بنیادوں پر اس کے معاشی نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اس کا فلسفۂ حیات، اسلام کے نظریۂ زندگی کی ضد ہے۔ اسی طرح جیسے دہریت اور اسلام ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ کمیونسٹ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے فلسفۂ حیات کو تسلیم کیا جائے، اور اسے تسلیم کرنے کے بعد، اسلام کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ یہ وجہ ہے جو ہم متعدد بار لکھ چکے ہیں کہ نہ کوئی کمیونسٹ مسلمان ہو سکتا ہے، اور نہ ہی کوئی مسلمان کمیونسٹ

یعنی کوئی شخص بیک وقت، مسلمان اور کمیونسٹ نہیں ہو سکتا۔ جو ایسا دعویٰ کرتا ہے (کہ وہ مسلمان بھی ہے اور کمیونسٹ بھی) وہ یا جاہل ہے یا منافق۔

البتہ جہاں تک کمیونزم کے معاشی نظام کا تعلق ہے، وہ قرآنِ حکیم کے معاشی نظام سے ایک حد تک ملتا جلتا ہے۔ بلکہ یوں کہیئے کہ جس حد تک کمیونزم یا سوشلزم جا سکی ہے۔ قرآن اس سے کہیں آگے جاتا ہے —— (پہ مدیر صاحب کے ایک خطاب کا عنوان ہی یہ تھا —— جہاں مارکس ناکام رہ گیا اس سے آگے!) یہ ہے ان دونوں نظاموں میں وہ جزوی مماثلت جس سے سطح بین مسلمان دھوکا کھا جاتے ہیں، اور اسلام اور کمیونزم کو ایک دوسرے کا حلیف سمجھنے لگتے ہیں، یا جس سے فائدہ اٹھا کر، کمیونسٹ، مسلمانوں کو دھوکا دینے میں (بعض اوقات) کامیاب ہو جاتے ہیں۔ وہ اقبالؒ کو کمیونسٹ ثابت کرنے میں اسی حربہ سے کام لیتے ہیں۔ حالانکہ، جس طرح اسلام کے معاشی نظام کو اس کے فلسفۂ حیات سے الگ نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح کمیونزم (یا سوشلزم) کے معاشی نظام کو اس کے نظریۂ زندگی سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ جس طرح مسلمان ہونے کے لئے، سب سے پہلے اسلام کے فلسفۂ حیات پر ایمان لانا ضروری ہے، اسی طرح کمیونسٹ ہونے کے لئے کمیونزم کے نظریۂ زندگی کا ماننا لاینفک ہے۔ اور جس طرح کوئی شخص، محض اسلام کے معاشی نظام کو صحیح سمجھ کر مسلمان نہیں ہو سکتا اسی طرح کوئی شخص محض کمیونزم کے معاشی نظام کو تسلیم کرلینے سے کمیونسٹ نہیں کہلا سکتا۔ اسلام اور کمیونزم دونوں میں، ان کے معاشی نظام کو ان کے فلسفۂ حیات سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا، کمیونزم کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے اس کے فلسفۂ حیات کا سمجھنا ضروری ہے۔

——— (۰) ———

جیسا کہ معلوم ہے، کمیونزم کا بانی کارل مارکسؔ تھا۔ وہ محض ایک ماہرِ معاشیات نہیں تھا۔ اس کا شمار فلاسفرز کے زمرہ میں بھی ہوتا ہے۔ اس نے بنیادی طور پر ایک فلسفہ پیش کیا تھا اور پھر، اس فلسفہ کی بنیادوں پر ایک معاشی نظام کا نقشہ دیا تھا جس کی ابتدائی شکل سوشلزم اور انتہائی کمیونزم ہے۔ لہٰذا، کمیونزم یا سوشلزم سے مراد ہے مارکسؔ کا پیش کردہ فلسفۂ حیات اور اس پر متفرع معاشی نظام۔ مارکسؔ نے فلسفۂ حیات کی رو سے، انسان کی زندگی بس یہی طبیعی زندگی ہے اور اس سے متعلق مسائل مادی۔ اس تصورِ حیات کے مطابق، نہ خدا کا وجود باقی رہتا ہے نہ وحی کا۔ جب وحی کا وجود باقی نہ رہے تو نہ نبوّت کا تصوّر باقی رہتا ہے، نہ اس کی وساطت سے عطا کردہ مستقل اقدار کا۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے بعد، حیاتِ اُخروی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ہے (مسئلہ زیرِ نظر کی حد تک) مارکسؔ کے فلسفۂ حیات کا ملخص۔

جہاں تک معاشی نظام کا تعلق ہے، مارکسؔ کے نظریہ کا ماحصل یہ ہے کہ

۱۔ نظامِ سرمایہ داری کا دَور ختم ہو چکا ہے۔ اب اس کی جگہ ایک ایسا نظام لے گا جو اس نظام (سرمایہ داری) کی ضد ہوگا۔

۲۔ اس (جدید) نظام میں، ذرائع پیداوار، افراد کی ذاتی ملکیت کے بجائے، محنت کشوں کی مشترکہ ملکیت (یا تحویل) میں رہیں گے۔

۳۔ فاضلہ دولت، جو نظامِ سرمایہ داری کی اصل و بنیاد ہے، کسی کے پاس نہیں رہے گی۔
۴۔ جب فاضلہ دولت کسی کے پاس نہیں رہے گی تو دولت کی بنیاد پر، دوسروں کی محنت کو غصب کر کے، مزید دولت کمانے کا سوال باقی نہیں رہے گا۔ نہ ذاتی جائیدادیں کھڑی کی جا سکیں گی۔ نہ انفرادی کارخانے لگائے جا سکیں گے نہ سودی کاروبار ہو سکے گا، نہ یہ صورت پیدا ہو سکے گی کہ

اُمتے بر اُمتے دیگر چرد!
دانہ ایں می کارد آں حاصل بُرد

ان تصریحات سے واضح ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے وہ مارکس کے پیش کردہ فلسفۂ حیات کا کبھی مؤید نہیں ہو سکتا۔ اسلام کا فلسفۂ حیات اور مارکسی فلسفۂ حیات ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

اب رہا معاشی نظام۔ سو اگر اسلام کا مفہوم غیر متعین رکھا جائے تو پھر مارکسی نظام، خلاف اسلام بھی ہو سکتا ہے اور مطابقِ اسلام بھی۔ لیکن اگر اس کے مفہوم کے لئے قرآنِ کریم کو حرفِ آخر قرار دے لیا جائے تو اس حقیقت کے اثبات میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ قرآنِ کریم نظامِ سرمایہ داری کا سخت دشمن ہے اور اشتراکی نظام کسی حد تک قرآن کے معاشی نظام کے مماثل ہے۔

آیئے، ہم دیکھیں کہ اقبالؒ اس باب میں کیا کہتا ہے۔

(۰)

اقبالؒ کا قلبِ دردآگیں

اقبالؒ نے اپنے سینے میں ایک دردآگیں قلب پایا تھا جو مفلسوں اور نادار محنت کشوں اور مزدوروں کی زبوں حالی پر خون کے آنسو بن کر اس کی چشمِ گریاں سے ٹپک پڑتا تھا۔ ان کی سب سے پہلی (نثر کی) کتاب "علم الاقتصاد" ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ وہ اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ تاریخِ انسانی کے سیلِ رواں میں، اصولِ مذہب بھی بے انتہا مؤثر ثابت ہوئے ہیں۔ مگر یہ بات بھی روزمرّہ کے تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہوتی ہے کہ روزی کمانے کا دھندا ہر وقت انسان کے ساتھ ساتھ ہے اور چپکے سے اس کے ظاہری و باطنی قویٰ کو اپنے سانچے میں ڈھالتا رہتا ہے۔ ذرا خیال کرو کہ غریبی، یا یوں کہو کہ ضروریاتِ زندگی کے کامل طور پر پورا نہ ہونے سے انسانی طرزِ عمل کہاں تک متاثر ہوتا ہے۔ غریبی قویٰ انسانی پر بہت بڑا اثر ڈالتی ہے، بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے مجلّا آئینہ کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی اور تمدنی لحاظ سے اس کا وجود و عدم برابر ہو جاتا ہے۔ معلّمِ اوّل، یعنی حکیم ارسطو سمجھتا تھا کہ غلامی تمدنِ انسانی کے قیام کے لئے ایک ضروری جزو ہے، مگر مذہب اور زمانہ حال کی تعلیم نے انسان کی جبلّی آزادی پر زور دیا اور رفتہ رفتہ مہذّب قومیں محسوس کرنے لگیں کہ یہ وحشیانہ نقادتِ مدارج، بجائے اس کے کہ قیامِ تمدن کے لئے ایک ضروری جزو ہو، اس کی تخریب کرتا ہے اور انسانی زندگی کے ہر پہلو پر نہایت مذموم اثر ڈالتا ہے۔ اسی طرح اس زمانے میں یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ آیا مفلسی بھی نظمِ عالم میں ایک ضروری

جزو ہے؛ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو؛ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دل خراش صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لئے صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے۔

یہ سنہ ۱۹۰۳ء کی بات ہے۔ غور کیجئے کہ اتنی سی عمر میں، اقبالؒ کے دل میں کس قسم کے سوالات اُبھر رہے تھے — یہ سوالات کہ

۱۔ آیا مفلسی بھی نظمِ عالم میں ایک ضروری جزو ہے؟ ..... اور

۲۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دل خراش صدائیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والا نظارہ ہمیشہ کے لئے صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے؟

ان سوالات میں "ہمیشہ کے لئے" کے الفاظ بڑے غور طلب ہیں۔ اقبالؒ کی باقی زندگی (منجملہ دیگر امور) انہی سوالات کے اطمینان بخش جواب کی تلاش میں گزری۔ ظاہر ہے کہ ان کا جواب ہمارے مروّجہ مذہب کے معاشی نظام سے نہیں مل سکتا تھا جس کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ نظمِ عالم کے لئے مفلسی ایک جزوِ لازم ہے۔ کیونکہ اگر مفلسی نہ رہے تو دولتمند لوگ صدقہ و خیرات دے کر ثواب کیسے حاصل کر سکیں گے، اور مفلسی سے کراہنے والوں کی دل خراش صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش نہیں ہونی چاہئیں۔ کیونکہ اگر ایسا ہو گیا تو صدقہ و خیرات سے متعلق احکامِ شریعت معطل ہو کر رہ جائیں گے۔

لیکن اقبالؒ نے ان سوالات کا جواب قرآنِ حکیم کے عالمگیر ابدی ضابطۂ حیات سے پا لیا۔ اور انہی جوابات کو وہ اُمت اور عالمگیر انسانیت کے سامنے پیش کرتے رہے۔ سب سے پہلے انہیں قرآن کی دفتین سے یہ جواب ملا کہ مفلسی اور ناداری کا بنیادی سبب، نظامِ سرمایہ داری ہے۔ اور جب تک اس نظام کی جڑیں نہیں کٹتیں، کراہنے والوں کی دل خراش صدائیں خاموش نہیں ہو سکتیں۔ ان صداؤں کا علاج، محتاجوں اور مفلسوں کی جھولی میں، بھیک کے ٹکڑے ڈال دینے میں نہیں۔ ان کا علاج، اس نظام کو بدل دینے میں ہے جو انہیں مفلس اور محتاج بناتا ہے۔

اقبالؒ اور نظامِ سرمایہ داری

اس حقیقت کے پیشِ نظر، اقبالؒ نے نظامِ سرمایہ داری کے خلاف جہاد کو اپنی زندگی کا مشن قرار دے لیا۔ وہ اپنی مشہور نظم "خضرِ راہ" میں — جو سنہ ۱۹۲۲ء (؟) میں کہی گئی تھی — خضرؑ سے سوال کرتے ہیں کہ

زندگی کا راز کیا ہے، سلطنت کیا چیز ہے
اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش؟

اور خضرؑ کی زبانی اس سوال کا یہ جواب دیتے ہیں کہ

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے!
خضر کا پیغام کیا، ہے یہ پیامِ کائنات

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر — شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار — انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات!

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اسی زمانہ میں، ان کا فارسی مجموعۂ کلام، پیامِ مشرق، شائع ہوا۔ اس کے آخری باب ۔۔۔ نقشِ فرنگ ۔۔۔ کا بیشتر حصہ، محنت اور سرمایہ کے اہم موضوع کے لئے وقف ہے۔ یہ اشعار فارسی زبان میں ہیں۔ طلوعِ اسلام میں جب بھی فارسی کے اشعار درج کئے جاتے ہیں تو اکثر یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ ان کا اُردو ترجمہ کر دیا جایا کرے کیونکہ اب فارسی بہت کم لوگ سمجھتے ہیں (بالخصوص ہماری نئی نسل کا تعلیم یافتہ طبقہ اس سے بے بہرہ ہوتا ہے ۔۔۔ ۔۔۔ یہ طالبِ علم تو اب اُردو سمجھنے سے بھی قاصر ہوتے جا رہے ہیں)۔ شعر کا ترجمہ نہ صرف اس کی شعریت ختم کر دیتا ہے بلکہ اس سے اس کی اثر انگیزی بھی باقی نہیں رہتی۔ اشعار کا مفہوم تو سمجھایا جا سکتا ہے، ان کا ترجمہ انہیں بے روح بنا دیتا ہے۔ اس لئے ہم نے ایسے مطالبات کے پورا کرنے سے اکثر معذرت چاہی ہے۔

اور پیامِ مشرق کے یہ اشعار، نہ صرف یہ کہ ان کی زبان فارسی ہے بلکہ ان میں جو فلسفہ پیش کیا گیا ہے وہ بھی بڑا دقیق ہے اس لئے بھی ان کا ترجمہ مفید مطلب نہیں ہو سکتا۔ بنا بریں ہم انہیں علیٰ حالہٖ پیش کر دینے پر مجبور ہیں۔

اس کی تلافی علامہ کے وہ اُردو کے اشعار کر دیں گے جو بعد میں آئیں گے۔

پیامِ مشرق کے آخر میں "صحبتِ رفتگان" کے زیرِ عنوان، حضرت علامہ سب سے پہلے ٹالسٹائے کی زبان سے کہلواتے ہیں۔

دار وئے بیہوشی است، تاج، کلیسا، وطن
جانِ خداداد را خواجہ بجامے خرید

اور کارل مارکس کے یہ الفاظ دہراتے ہیں کہ

رازدانِ جزو و کل، از خویش نامحرم شد است
آدم از سرمایہ داری، قاتلِ آدم شد است

ٹالسٹائے، ہیگل کے فلسفۂ اضداد کو "عقلِ دو رُد" کی تخلیق قرار دے کر، اس پر، ان الفاظ میں سخت تنقید کرتا ہے کہ اس کی رُو سے وہ

درسِ رضا می دہد بندۂ مزدور را[ط]

ایرانی تحریکِ کمیونزم کا بانی، مزدک، دورِ حاضر کی اضطراب انگیزیوں کو دیکھ کر، پکار اُٹھتا ہے کہ

دانۂ ایراں زکشتِ دارو قیصر برد مید مرگِ نو می رقصد اندر قصرِ سلطان و امیر
مدتے در آتشِ نمرود می سوزد خلیل!
تا تہی گردد حریمش از خداوندانِ پیر

ط: انسانوں کا خود ساختہ مذہب، غریب کو تقدیرِ خداوندی پر شاکر رہنے کی تلقین سے درسِ رضا دیتا ہے۔

دورِ پرویزی گذشت، اے کشتۂ پرویز خیز
نعمتِ گم گشتۂ خود را ز خسرو باز گیر[۱]

اس کے ساتھ ہی، مزدوروں کا نمائندہ، کوہکن (فرہاد) اس نفیرِ قیامت خیز کے ساتھ سامنے آتا ہے۔

نگارِ من کہ بسے سادہ و کم آمیز است　　ستیزہ کیش و ستم کوش و فتنہ انگیز است
بروں او ہمہ بزم و درونِ او ہمہ رزم　　زبانِ او ز مسیح و دلش ز چنگیز است
اگرچہ تیشۂ من کوہ را ز پا آورد!　　ہنوز گردشِ گردوں بکامِ پرویز است

ز خاک تا بہ فلک ہر چہ ہست رہ پیماست
قدم کشائے کہ رفتارِ کارواں تیز است

اس کے بعد ہمارے سامنے فرانسیسی فلاسفر، آگسٹس کومٹ اور مردِ مزدور کا مکالمہ آتا ہے۔ کومٹ، فلسفۂ مادیت کا علمبردار تھا اور طبقات کی تقسیم کو مطابق فطرت قرار دیتا تھا۔ اس کے فلسفہ کے جواب میں، مردِ مزدور کہتا ہے۔

فریبی بہ حکمت مرا اے حکیم　　کہ نتواں شکست ایں طلسمِ قدیم
مسِ خام را از زر اندودۂ؛　　مرا خوئے تسلیم فرمودۂ؛
حقِ کوہکن دادی اے نکتہ سنج　　بہ پرویزِ پرکار و نابردہ رنج؛
جہاں راست بے روزی از دستِ مزد　　ندانی کہ ایں ہیچ کارہ است دزد

پئے جسمِ او پوزشش آوردۂ؛
بایں عقل و دانش فسوں خوردۂ؛

ازاں بعد، سرمایہ دار اور مزدور کا "قسمت نامہ" ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس تقسیم کی رُو سے، سرمایہ دار، مزدور سے کہتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہے اس میں تمہارا بھی حصّہ ہے اور میرا بھی۔ اس کی تقسیم یوں ہوگی کہ

غوغائے کارخانۂ آہنگری ز من　　گلبانگِ ارغنونِ کلیسا از آنِ تو
نخلے کہ شہ خراج بروی نہد ز من　　باغِ بہشت و سدرہ و طوبیٰ از آنِ تو
تلخابہ کہ دردِ سر آرد، از آنِ من　　صہبائے پاکِ آدم و حوّا از آنِ تو

ایں خاک و آنچہ در شکمِ او از آنِ من
وز خاک، تا بہ عرشِ معلّیٰ از آنِ تو

اور پھر مزدور کی یہ دل خراش صدائے دردناک ہمارے کانوں میں آتی ہے۔

ز مزدِ بندۂ کرپاس پوش و محنت کش
نصیبِ خواجۂ ناکردہ کار رختِ حریر

---

[۱] ایران کے حالیہ انقلاب کی روشنی میں ان اشعار کا صحیح مفہوم سمجھ میں آسکتا ہے۔

ز خوئے فشانیِ من لعلِ خاتمِ والی ز اشکِ کودکِ من گوہرِ ستامِ[1] امیر
ز خونِ من چو زلو[2] فربہی کلیسا را بزورِ بازوئے من دستِ سلطنت ہمہ گیر

خرابہ رشکِ گلستاں ز گریۂ سحرم
شبابِ لالہ و گل از طراوتِ جگرم

اور اس کا ردِ عمل ——

بیا کہ تازہ نوا می تراود از رگِ ساز مئے کہ شیشہ گدازد بہ ساغر اندازیم
مغان و دیرِ مغاں را نظامِ تازہ دہیم بنائے میکدہ ہائے کہن بر اندازیم
ز رہزنانِ چمن انتقامِ لالہ کشیم بہ بزمِ غنچہ و گل طرحِ دیگر اندازیم

بطوفِ شمع چو پروانہ زیستن تا کے
ز خویش ایں ہمہ بیگانہ زیستن تا کے

آگے بڑھنے سے پہلے، ذرا اس حقیقت کو سامنے لائیے کہ یہ اشعار سنہ ۱۹۲۳ء سے پہلے کے کہے گئے ہیں۔ اس کے بعد نظامِ سرمایہ داری اور محنت کشوں میں جو کشمکش ہوئی ہے اور دنیا کے معاشی نظام میں جس قدر انقلابات آئے ہیں، ان اشعار میں ان کی کس طرح پیش گوئی کی گئی ہے۔ اسے کہتے ہیں فراستِ مردِ مومن! —— حضرتِ علامہؒ نے سچ کہا تھا کہ

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے عکس اُس کا میرے آئینۂ ادراک میں ہے

اس میں ایک نکتہ یہ بھی قابلِ غور ہے کہ انہوں نے "آئینۂ ادراک" کہا ہے۔ یعنی ان کی فکر —— کشف و الہام نہیں کہا جس کے دعویدار "مامور من اللہ" بن جاتے ہیں۔

—— (٠) ——

اب آگے چلیئے۔ زبورِ عجم میں یہ حشر بداماں پیغامِ انقلاب ہمارے سامنے آتا ہے۔

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب

انقلاب

انقلاب اے انقلاب (زبور ص۱۳۴)

—— (٠) ——

"بالِ جبریل" میں فرشتوں کا گیت، اسی روحِ انقلاب کا طنزیہ نشتر ہے۔ وہ خدا ئے کائنات کو مخاطب کر کے شکوہ سنج ہیں کہ

عقل ہے بے زمام ابھی، عشق ہے بے مقام ابھی
نقش گرِ ازل! ترا نقش ہے نا تمام ابھی!

---

[1] گھوڑے کی زین۔ [2] زلو۔ جونک۔

خلق خدا کی گھات میں رند و فقیہہ و میر و پیر
تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست، تیرے فقیر حال مست!
بندہ ہے کوچہ گرد ابھی، خواجہ بلند بام ابھی (ص ۱۴۸)

اور یہی وہ "عرش کے کنگورے ہلا دینے والا" احتجاج ہے جس کے جواب میں خدا کی طرف سے فرشتوں کو حکم ملتا ہے کہ اس انسانیت کش نظام کو اُلٹنے کے لئے

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو!
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی — اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے — پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اُٹھا دو
حق را بسجودے صنماں را بطوافے — بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو (ص ۱۴۹)

یہی بات ضربِ کلیم میں ان الفاظ میں کہی گئی ہے کہ

اے شیخ امیروں کو مسجد سے نکلوا دے
ہے ان کی نمازوں سے محراب ترش ابرو (ص ۱۷۶)

اس لئے کہ

کثرتِ نعمت گداز از دل بُرد — نازمی آرد نیاز از دل برد
سالہا اندر جہاں گردیدہ ام
نم بچشمِ منعماں کم دیدہ ام (جاوید نامہ)

بالِ جبریل میں ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے۔ "لینن ـــــ خدا کے حضور"! ۔ آپ غور کیجئے کہ خدا کا منکر لینن، خدا سے کیا شکایت کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

اک بات اگر مجھ کو اجازت ہو تو پوچھوں — حل کر نہ سکے جس کو حکیموں کے مقالات

وہ بات کیا ہے جسے گوش گذار کرنے کی اس طرح اجازت مانگی گئی ہے؟ وہ بات وہی ہے جو ہر کمیونسٹ کے دل میں کھٹکتی ہے کہ

وہ کونسا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود؟ — وہ آدمِ خاکی کہ جو ہے زیرِ سماوات؟

اس "آدمِ خاکی" کے تو خدا اور ہی ہیں؟

مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی!
مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات!

ان "خداوندانِ فرنگ" کے نظامِ سرمایہ داری کا یہ عالم ہے کہ

ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے   سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگِ مفاجات
یہ علم یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت   پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات

اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ

آثار تو کچھ کچھ نظر آتے ہیں کہ آخر   تدبیر کو تقدیر کے شاطر نے کیا مات
میخانے کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل   بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیرانِ خرابات!
چہروں پہ جو سرخی نظر آتی ہے سرِ شام   یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات

اور اس کے بعد دیکھئے کہ وہ کس حسرت آمیز یا طنز آلود لہجہ میں کہتا ہے کہ

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں   ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟   دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات! (ص ۱۴۰)

عصرِ حاضر کا علم و حکمت، تدبر و حکومت، کس طرح نظامِ سرمایہ داری کے آلۂ کار ہیں۔ اقبالؒ، مختلف مقامات پر، مختلف انداز سے اس کی وضاحت کرتا ہے۔ ارمغانِ حجاز میں ایک بڑی جامع نظم ہے جس کا عنوان ہے۔ "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ"۔ اس میں ابلیس کا ایک مشیر، مختلف نظام ہائے حکومت کا تجزیہ کرنے کے بعد کہتا ہے کہ

کاروبارِ شہریاری کی حقیقت اور ہے   یہ وجودِ میر و سلطاں پر نہیں ہے منحصر
مجلسِ ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو   ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر (ص ۲۱۷)

دوسری جگہ اس حقیقت کو بڑے انوکھے اور نہایت دلچسپ انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ اس میں ایک دوزخی خدا سے مناجات کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

یہ علم، یہ حکمت، یہ سیاست، یہ تجارت   جو کچھ ہے وہ ہے فکرِ ملوکانہ کی ایجاد

اور درگاہِ باری تعالیٰ میں سجدۂ شکرانہ بجا لاتے ہوئے کہتا ہے کہ

اللہ ترا شکر کہ یہ خطۂ پرسوز   سوداگرِ یورپ کی غلامی سے ہے آزاد (ارمغان ص ۲۴۲)

علامہ، دورِ حاضر کے طالب علم سے کہتے ہیں:۔

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا، جس نے   قبض کی روح تری دے کے تجھے فکرِ معاش
(ضربِ کلیم ص ۸۲)

ارمغانِ حجاز میں وہ اُس سے کہتے ہیں:۔

مرا کافر کند اندیشۂ رزق   ترا کافر کند علمِ کتابی (ص ۱۵۴)

جاوید نامہ میں، مسلمانوں کی تباہی و بربادی کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

چار مرگ اندر پئے ایں دیر میر   سود خوار و والی و ملا و پیر

دوسرے مقام پر ہے:۔

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری   اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری

نظامِ سرمایہ داری کے علمبردار، غریبوں اور ناداروں کو جس اسلام کا سبق پڑھاتے ہیں، اقبالؒ اسے ابلیس کا پیدا کردہ فریب قرار دیتا ہے۔ چنانچہ ارمغانِ حجاز میں ابلیس کی زبان سے کہلوایا گیا ہے۔

میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا — میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں

(۱)

لینن نے خدا سے پوچھا تھا کہ

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ — دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

اقبالؒ اس کے جواب میں کہتا ہے کہ اس میں اب زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ مجھے تو نظر آرہا ہے کہ

گیا دورِ سرمایہ داری گیا! — تماشا دکھا کر مداری گیا (بالِ جبریل)

لیکن وہ کہتے یہ ہیں کہ نظامِ سرمایہ داری، کمیونزم یا سوشلزم کے ہاتھوں نہیں ٹوٹے گا، اس لئے کہ ان کا معاشی نظام چل ہی نہیں سکتا۔ یہ خود ناکام رہ جائے گا۔

دستِ فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک — مزدکی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو

(ارمغانِ حجاز صفحہ ۲۲۳)

اس نظام کا سفینہ، اسلام کے ہاتھوں ڈوبے گا جس کے نظام کی حقیقت یہ ہے کہ وہ

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے — نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیرِ رہ نشیں (صفحہ ۲۲۵)

اس کے بعد وہ بتاتے ہیں کہ اسلام کا وہ نظام کیا ہے جس کے ہاتھوں نظامِ سرمایہ داری کا خاتمہ ہوگا۔

مثبت نظامِ معیشت

نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ ذرائع پیداوار افراد کی ذاتی ملکیت میں رہنے چاہئیں۔ اقبالؒ کے نزدیک یہ نظریہ، قرآنی نظریۂ معیشت کی یکسر نقیض ہے اور ابلیسانہ فکر کی ایجاد۔ ذرائع پیداوار میں بنیادی حیثیت زمین (ارض) کو حاصل ہے۔ اس باب میں اقبالؒ کا نظریہ اس قدر واضح ہے کہ اس میں دو آراء ہو نہیں سکتیں۔ جاوید نامہ میں انہوں نے "محکماتِ عالمِ قرآنی" کے جو تین ستون بیان کئے ہیں، ان میں ایک ستون یہ ہے کہ

ارض ملکِ خدا است

اس عنوان کے تابع وہ لکھتے ہیں:

حق زمیں را جز متاعِ ما نگفت — ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت

دہ خدایا! نکتۂ از من پذیر — رزق و گور از وے بگیر او را مگیر!

باطنِ "الارض للہ" ظاہر است

ہر کہ ایں ظاہر نبیند کافر است (ص ۸)

آخری شعر میں اقبالؒ ایک عظیم حقیقت بیان کر گیا ہے۔ ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ "الارض للہ" (یعنی ارض خدا کی ملکیت ہے) کا اعتراف کرتا ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ یہ محض نظری عقیدہ ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ کائنات

میں جو کچھ ہے سب خدا کی ملکیت ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ "الارض للہ" عقیدہ کی حد تک توصحیح ہے۔ عملی نظام ایسا نہیں ہو سکتا۔ علامہ اقبالؒ کہتے ہیں کہ "الارض للہ" کا نظری عقیدہ دیا ہی اس لئے گیا ہے کہ اس کے مطابق معاشی نظام متشکل کیا جائے۔ اگر اس عقیدہ کو محض نظری طور پر مانا جائے اور عملی نظام اس کے خلاف ہو تو یہ اسلام نہیں، کفر ہے۔

غور فرمائیے، اقبالؒ کس طرح مسئلہ ملکیتِ زمین کو کفر و ایمان کی بنیاد قرار دیتے ہیں ؟
آگے چل کر کہتے ہیں :-

رزقِ خود را از زمین بُردن رواست　　　این "متاع" بندہ و ملکِ خداست　　(ص ۹۰)

اور اس کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں :-

ایکہ می گوئی متاعِ ما ز ماست　　　مردِ ناداں این ہمہ ملکِ خداست
ارضِ حق را ارضِ خود دانی ، بگو　　　چیست شرحِ آیۂ لَا تُفْسِدُوْا[۱]
ابنِ آدم دل بابلیسی نہاد !　　　من ز ابلیسی ندیدم جز فساد

بردۂ چیزے کہ از آنِ تو نیست !
داغم از کارے کہ شایانِ تو نیست　　(ص ۱۲۵)

اور اس کے بعد کہتے ہیں کہ

ملکِ یزداں را بہ یزداں باز دہ　　　تا ز کارِ خویشتن بکشائی گرہ

"ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" (ارمغانِ حجاز) میں، ابلیس کی زبان سے کہلوایا گیا ہے۔

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں !

"بالِ جبریل" میں اس اجمال کی تفصیل حسبِ ذیل الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ نظم کا عنوان ہے۔

اَلْاَرْضُ لِلّٰہِ !

وہ زمیندار کو (جو اپنے آپ کو زمین کا مالک سمجھتا ہے) مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ یہ بتاؤ کہ

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون ؟　　　کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب ؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار ؟　　　خاک یہ کس کی ہے، کس کا ہے یہ نورِ آفتاب ؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب ؟　　　موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب ؟

دہ خدایا ! یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں میری نہیں[۲]

---

۱ وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا۔ (۷/۸۵)
۲ یہ اشعار، قرآنی آیات (۵۶/۶۳ — ۷۳) کی تفسیر ہیں۔

جب یہ زمین تیرے آباء کی نہیں تھی تو اسے وراثت میں پا کر مالک بننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور جب یہ نہ تیری ہے نہ غیری، تو اسے کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کیسے کیا جا سکتا ہے؟ یہ خدا کی ہے۔ اور قرآن کی رو سے جس چیز کو خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے، اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ تمام انسانوں کے فائدے کے لئے کھلی رہے گی، کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں جا سکے گی۔ جیسے اس نے جب کعبہ کے متعلق کہا کہ وہ میرا گھر (بیتی) ہے تو اس کے ساتھ ہی کہہ دیا کہ اسے مثابۃ للناس بنایا گیا ہے۔ یعنی تمام نوعِ انسانی کے فائدے کے لئے۔ اس لئے وہ سواء ن العاکف فیہ والباد ہے۔ یعنی وہاں کے رہنے والوں اور باہر سے آنے والوں، سب کے لئے یکساں طور پر کھلا۔ یہی حیثیت زمین کی ہے۔ وہ نوعِ انسانی کے لئے متاع (سامانِ زیست حاصل کرنے کا ذریعہ) ہے۔ کسی کی ذاتی جائیداد نہیں۔

فاضلہ دولت

زمین سے آگے بڑھئے تو، نظامِ سرمایہ داری کی دوسری بنیاد فاضلہ دولت ...... (SURPLUS MONEY) ہے۔ اس سلسلہ میں قرآنِ کریم کا فیصلہ صاف اور واضح ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔ یَسْـَٔلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ۔ اے رسولؐ! تجھ سے یہ لوگ پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دولت نوعِ انسان کی ربوبیتِ عامہ کے لئے دے دیں۔ قُلِ الْعَفْوَ۔ ($\frac{2}{219}$) ان سے کہہ دو کہ تمہاری ضروریات سے زائد جس قدر ہے، سب کی سب۔ اس فیصلہ نے فاضلہ دولت کا تصور ہی ختم کر دیا۔ قرآنِ کریم کے اسی فیصلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، اقبالؒ جاوید نامہ میں کہتے ہیں کہ قرآن نے:

با مسلماں گفت جاں بر کف بنہ
ہر چہ از حاجت فزوں داری بدہ

جب روس میں اشتراکیت کا انقلاب برپا ہوا تو اقبالؒ کی نگہ ژرف بین و دُور رس نے اس میں فطرت کے اس اشارہ کو مضمر دیکھا کہ وہ دَور قریب آ رہا ہے جب قرآن کا معاشی نظام وجہ شادابیٔ عالم بن جائے گا۔ ضربِ کلیم کی یہ نظم (جس کا عنوان اشتراکیت ہے) اسی حقیقت کی پردہ کشائی کرتی ہے۔ کہتے ہیں:۔

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ رفتار

اندیشہ ہوا شوخیٔ افکار پہ مجبور　　فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار
انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر　　کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں　　اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار

جو حرفِ قُلِ الْعَفْو میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دَور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

جب قرآن کی یہ مضمر حقیقت نمودار ہو گی تو اس وقت اس دنیا کا نقشہ کیا ہو گا، اسے اقبالؒ نے، جاوید نامہ میں، فلکِ مریخ پر، شہر مرغدین (دین کا گلستان) کے رنگ میں پیش کیا ہے۔ اس میں

سخت کش دہقاں چراغش روشن است　　از نہابِ دہ خدایاں ایمن است

کشتِ کارش بے نزاعِ آبجوست — حاصلش بے شرکتِ غیرے ازاوست (ص۱۲۱)

اور

نے بہ بازاراں ز بیکاراں خروشش — نے صدا ہائے گدایاں دردِ گوشش

اقبالؒ اپنی سنہ ۱۹۰۷ء کی آرزو کو (جس کا ذکر شروع میں کیا جا چکا ہے) قرآنی نظام کی اس آئیڈیل دنیا میں پورا ہوتے دیکھتا ہے جہاں کیفیت یہ ہے کہ

کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست (ص۱۲۰)

اسی کو وہ دین کا ماحصل قرار دیتا ہے جب کہتا ہے کہ

کس نگردد در جہاں محتاجِ کس!
نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس (پس چہ باید کرد ص۴۱)

(٠)

اقبالؒ نے جو کچھ نظامِ سرمایہ داری کے خلاف کہا ہے، مارکسزم کے حامی اسی کی سند سے اسے (اقبالؒ کو) کمیونسٹ ثابت کرتے ہیں۔ لیکن یہ ان کی غلط نگہی یا فریب انگیزی ہے۔ یہ اقبالؒ کے پیش کردہ نظام یا پیغام کا آدھا حصہ۔ اس کے ساتھ اس کا باقی نصف حصہ ملانے سے پیغامِ اقبالؒ کا صحیح تصور سامنے آ سکتا ہے۔ علامہ نے (جاوید نامہ میں) اس غلط نگہی یا فریب کاری کی بڑے لطیف انداز میں پردہ دری کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلامی نظام کے ادھورے مطالعہ سے ابوجہل نے بھی یہی کہا تھا کہ جو کچھ یہ رسول (نبی اکرمؐ) مساوات کے نام سے پیش کر رہا ہے، یہ درحقیقت مزدکیت[۱] سے مستعار لیا ہوا نظریہ ہے جسے سلمانؓ اپنے ساتھ فارس سے لایا ہے۔ اور یہاں اسے اسلام کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس نے کہا کہ

ایں مساوات، ایں مواخات، اعجمی است — خوب می دانم کہ سلمانؓ مزدکی است

(جاوید نامہ۔ نوحۂ ابوجہل۔ ص۵۹)

اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم دیکھیں کہ علامہ اقبالؒ نے (قرآن کریم کی روشنی میں) کمیونزم یا اشتراکیت کے متعلق کیا کہا ہے۔ اس سے کمیونسٹوں کی مغالطہ آفرینی اور فریب دہی کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔

کمیونزم کی مخالفت

جب ۱۹۱۷ء میں روس میں کمیونزم کا سیلاب اُمڈا تو اس نے دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ وہ انقلاب تھا بھی بڑا زلزلہ انگیز۔ سطح بین نگاہوں نے اسے محض ایک معاشی نظام سمجھا اور نظامِ سرمایہ داری کے حامیوں کی طرف سے اس

[۱] عصرِ قدیم میں ایرانی کمیونزم۔

کی مخالفت ہوتی۔ لیکن علامہ اقبالؒ نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا ——— اور انہیں ایسا کرنا بھی چاہیئے تھا۔ جس انقلاب کا دعویٰ ہو کہ وہ ہر نظامِ کہن کی بساط اُلٹ کر ایک جدید نظام دنیا پر مسلّط کرے گا جس سے غریبوں اور محتاجوں کی دردناک صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں گی اس کا گہری نظروں سے جائزہ اقبالؒ نہ لیتا تو اور کون لیتا؟ انہوں نے جب اس فلسفۂ حیات پر نگاہ ڈالی جس کی بنیادوں پر اس عظیم معاشی نظام کی عمارت استوار کرنا مقصود تھا تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ نظام کبھی کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ انہوں نے اپنے ان تأثرات کو (اپنی مثنوی "پس چہ باید کرد" میں) ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ　　لا سلاطین، لا کلیسا، لا اِلٰہ

انہوں نے کہا کہ یہ منفیانہ فلسفہ انسانی زندگی کی اساس نہیں بن سکتا۔ زندگی مثبت بنیادوں پر ہی قائم رہ سکتی ہے۔

در مقامِ لا نیا ساید حیات　　سوئے اِلّا می خرامد کائنات

لا و اِلّا برگ و سازِ اُمتاں؛　　نفی بے اثبات مرگِ اُمتاں

زندگی خلا میں باقی نہیں رہ سکتی۔ اگر آپ خلا کو پُر کرنے کے لئے تعمیری اقدار مہیّا نہیں کریں گے تو تخریبی قوتیں وہاں اپنا ڈیرہ جما لیں گی۔ مشہور مغربی فلاسفر پیسکال نے لکھا ہے:۔

انسانی ذہن اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ وہ کسی نہ کسی چیز پر ایمان رکھے۔ خلا قدرت کے کارخانے میں محال ہے۔ اور محض مادی دنیا ہی میں نہیں بلکہ اخلاقی اور روحانی دنیا میں بھی خلا ناممکن ہے۔ انسان جب خدا پر ایمان چھوڑ دے تو شیطان کی پرستش کرنے لگتا ہے اور اچھے نصب العینوں سے دستکش ہو جائے تو بُرے راستے اس کو خوش آتے ہیں۔ وہ زندگی جس میں نہ ایمان کی گرمی ہو اور نہ اخلاقی ضابطہ کی کشش، وہ زندگی موت سے بدتر ہوتی ہے۔ (انسان نے کیا سوچا؟ - صفحہ ۳۳۹)

اقبالؒ نے کہا کہ لا سلاطین اور لا کلیسا کی حد تک تو بات ٹھیک ہے کہ یہ دونوں قوتیں تخریبی ہیں۔ اور انسانیت کی بلندی کے راستے میں بری طرح حائل، اس لئے ان کا مٹانا ضروری ہے۔ لیکن اگر اِلٰہِ حقیقی کا بھی انکار کر دیا جائے تو اس سے مستقل اقدارِ خداوندی کا انکار لازم آجاتا ہے۔ اور جب انسانی زندگی میں اقدار کی کارفرمائی نہ رہے تو پھر انسان حیوانوں کی سطح پر آجاتا ہے جس میں "روٹی" کے سوا کوئی مقصدِ حیات نہیں رہتا۔ اقبالؒ نے اس ضمن میں کہا کہ

دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس!　　بر مساواتِ شکم دارد اساس

تا اخوّت را مقام اندر دل است　　بیخِ او در دل، نہ در آب و گِل است　　(جاوید نامہ صفحہ ۶۹)

طبیعی (یا حیوانی زندگی) کی مساوات کچھ معنی نہیں رکھتی۔ طبیعی زندگی کی ضروریات کا پورا ہونا بیشک لازمی ہے لیکن حقیقی مساوات شرف و تکریمِ انسانیت میں مضمر ہے۔

برتر از گردوں مقامِ آدم است
اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

اور احترامِ آدم مستقل اقدارِ خداوندی کے اتباع سے حاصل ہو سکتا ہے۔ ان اقدار کے انکار سے "حیوانِ آدم"

تو زندہ رہ سکتا ہے، "انسانی آدم" زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسی لئے انہوں نے کہا کہ

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامانِ موت فیصلہ تیرا تیرے ہاتھوں میں ہے، دل یا شکم

(بالِ جبریل۔ ص۵۹)

جہاں تک لاسلاطین کا تعلق ہے انہوں نے کہا کہ حکومت کی شکل بدل دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ یورپ نے شہنشاہیت کو ختم کرکے جمہوریت کی طرح ڈالی تو اس سے محض حکومت کی شکل بدلی۔ بعض انسانوں کا دوسرے انسانوں پر حکومت کرنے کا سلسلہ ویسے ہی رہا۔ اگر روس، زار کی شہنشاہیت کو ختم کرکے اس کی جگہ "مزدوروں" کی حکومت قائم کر دے گا تو اس سے انسانیت کُش استبداد میں کمی واقع نہیں ہو جائے گی۔

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

(بالِ جبریل۔ ص۶۲)

کمیونزم کے فلسفہ اور نظام کا اس طرح گہری نظروں سے تجزیہ کرنے کے بعد اقبالؒ نے ملّتِ روسیہ کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ

تو کہ طرحِ دیگرے انداختی دل ز دستورِ کہن پرداختی
کردہٗ کارِ خداوندان تمام بگذر از لا، جانبِ اِلّا خرام
در گذر از لا اگر جویندۂ تا رہِ اثبات گیری زندۂ
اے کہ مے خواہی نظامِ عالمے
جستۂ او را اساسِ محکمے

"اساسِ محکم" کا ذکر کرتے ہوئے اقبالؒ نے کارل مارکس کی ایک بنیادی معذوری کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ نوعِ انسانی کی مشکلات کا حل اسی معاشی نظام میں مضمر ہے۔ جس میں:۔

ہر فرد اپنی استعداد کے مطابق کام کرے اور ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق ملے

مارکس کے رفقاء نے کہا کہ یہ بہت بڑا انقلابی دعویٰ ہے۔ اسے آپ عملاً متشکل کیجئے۔ اس پر مارکس نے کہا کہ میں اس سے معذور ہوں۔ انسانی مشکلات کا حل تو وہی ہے جسے میں نے پیش کیا ہے لیکن میں ابھی تک سمجھ نہیں سکا کہ وہ جذبۂ محرکہ کیا ہوگا جس کی رُو سے ایک شخص جان مار کر دن رات محنت کرے اور اس کے ماحصل میں سے اپنے لئے صرف اتنا لے جتنے کی اسے ضرورت ہے، اور باقی سب دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دے۔ جب تک مجھے اس جذبۂ محرکہ کا علم نہ ہو جائے میں اس کے لئے عملی قدم اٹھانے کے لئے تیار نہیں، کیونکہ اس کے بغیر اس نظام کا قیام ناممکن ہے۔ اس کی پارٹی میں کافی عرصہ تک یہ بحث جاری رہی لیکن جب وہ کسی صورت میں بھی عمل اقدام کے لئے تیار نہ ہوا تو اس کی پارٹی کے کئی ممبر دل برداشتہ ہو کر اس سے علیحدہ ہو گئے۔ اس نے ان سے کہا کہ تم اس اختلاف کی وجہ سے مجھ سے الگ ہوتے ہو تو ہو جاؤ لیکن میں تمہاری رضا جوئی کی خاطر ایسا قدم اٹھانے کے لئے تیار نہیں جسے میں ممکن العمل نہیں سمجھتا۔ ایسا کرنا منافقت ہوگا۔

یہ ہے وہ جذبۂ محرکہ جسے اقبالؒ نے اس قسم کے نظام کے لئے اساسِ محکم قرار دیا اور اس سلسلے

میں روسؔ سے کہا:-

داستانِ کہنہ شستی باب باب　　فکر را روشن کن از اُمّ الکتاب

کیا اس کے بعد کوئی شخص اقبالؒ کو کمیونسٹ کہہ سکتا ہے؟ اقبالؒ نے کمیونزم کے معاشی نظام اور اس کے فلسفۂ زندگی کو الگ الگ کر کے دونوں پر تبصرہ کیا اور اسی لحاظ سے مارکسؔ کے قلب اور دماغ کا بھی الگ الگ تجزیہ کیا۔ اس نے کہا کہ مارکسؔ نے نوعِ انسان کی معاشی مشکلات کا جو حل تجویز کیا ہے وہ مبنی بر حقیقت ہے۔ قرآن کریم نے یہی حل بتایا تھا اور اسلام کے صدرِ اوّل میں اسے عملاً متشکل کر کے دکھا دیا گیا تھا۔ لیکن اس کا (مارکسؔ کا) فلسفۂ حیات جو مستقل اقدارِ خداوندی کے انکار پر متفرع ہے یکسر باطل ہے۔ چنانچہ وہ مارکسؔ کی زندگی کے گوشۂ اوّل کی بڑی تعریف کرتا ہے لیکن اس کے دوسرے گوشے کی بنا پر اس کی تردید بھی اسی شدت کے ساتھ کرتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:-

صاحبِ سرمایہ از نسلِ خلیل!　　یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل

مارکسؔ کی بنیادی کتاب کا نام "سرمایہ" (DAS CAPITAL) ہے اور چونکہ وہ یہودی تھا اس لئے اسے "از نسلِ خلیل" کہا گیا ہے اور "پیغمبرِ بے جبرئیل" کہہ کر اس کے پیغام کے دونوں گوشوں کو جس طرح منعکس کیا گیا ہے اس کی داد صاحبِ نظر ہی دے سکتے ہیں۔ اسی تجزیہ کو انہوں نے ارمغانِ حجاز میں ابلیس کے مشیر کی زبان سے ان الفاظ میں پیش کیا ہے:-

وہ کلیم بے تجلی، وہ مسیح بے صلیب　　نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب

اور ذیل کے شعر میں انہوں نے ان "متشابہات" کو "محکمات" کے پیکر میں پیش کر دیا ہے جہاں کہا ہے کہ

زانکہ حق در باطلِ او مضمر است　　قلبِ او مومن دماغش کافر است

کس قدر برجستہ اور بلیغ ہے یہ تجزیہ جس کی رُو سے کہا گیا ہے کہ، اس کا قلبِ دردآگیں مفلسوں، محتاجوں، مزدوروں، محنت کشوں کے مسائل کے احساس سے وقفِ اضطراب تھا۔ اس لئے اس کا قلب مومن تھا لیکن اس لئے وحی کی روشنی سے محروم رہ جانے کی بنا پر جو فلسفۂ حیات پیش کیا وہ یکسر باطل ہے۔ مارکسؔ (یا کمیونزم) کی بے بصری پر اقبالؒ کا دل کڑھتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وحی کی اساسِ محکم موجود نہ ہونے کی وجہ سے اس قدر عظیم انقلاب نہ صرف ناکام رہ جائے گا بلکہ فسادِ انسانیت کا موجب بن جائے گا۔ وہ ہزار جان سے چاہتا تھا کہ اس انقلاب کے داعی اپنے فلسفۂ حیات کے لئے قرآن سے راہ نمائی حاصل کریں تاکہ یہ معاشی انقلاب موجبِ تعمیرِ انسانیت ہو جائے۔ اس سے یہ معاشی نظام قرآنی نظام کے مماثل ہو جائے گا۔ اس ضمن میں انہوں نے سر فرانسس ینگ ہسبنڈ کو ۱۹۳۱ء میں لکھا تھا:-

بالشویزم کے ساتھ اگر خدا کو ملا دیا جائے تو یہ نظام اسلامی نظام کے مماثل ہو سکتا ہے۔

―――(۰)―――

علامہ اقبالؒ نے اپنی تنقید میں صرف روس کو مخاطب کیا ہے، چین کا ذکر نہیں کیا۔ یہ اس لئے کہ ان کی زندگی میں چین، کمیونسٹ مملکت کی حیثیت سے ابھرا نہیں تھا۔ لیکن علامہ کی تنقید، کمیونزم کے خلاف ہے، وہ کسی ملک میں بھی کارفرما کیوں نہ ہو۔ یہ حیثیت قابلِ غور ہے کہ انہوں نے جو کہا تھا کہ کسی محکم بنیاد کے نہ ہونے کی وجہ سے یہ نظام کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ ان کی یہ "پیش گوئی" حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ روس نے تو پھر بھی ناکام ہونے کے لئے کچھ عرصہ لیا، چین کا نظام ماؤزے تنگ کی شخصیت کے ساتھ وابستہ تھا۔ اس کی وفات کے ساتھ ہی اس (بظاہر) فلک بوس عمارت کی اینٹیں ایک ایک کر کے گرنی شروع ہو گئیں اور اب وہ تھوڑے ہی عرصہ کی مہمان نظر آتی ہے۔ سچ کہا تھا حضرت علامہؒ نے کہ انسانیت لا (کے خلا) میں زندہ نہیں رہ سکتی! اے کاش! اس وقت دنیا میں کہیں قرآن کے اِلّا کا نظام قائم ہوتا تو اس کے عالم گیر ہونے کے لئے فضا بڑی سازگار تھی۔ لیکن اس میں مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔ نظامِ سرمایہ داری کی ناکامی کے بعد، نظامِ کمیونزم کا ناکام تجربہ، انسانیت کو قرآن کے اِلّا کی طرف آنے کے لئے مجبور کر دے گا۔ قُلِ الْعَفْوَ کا دور آ کر رہے گا۔

(۵)

ان تصریحات سے علامہ اقبالؒ کے مسلک کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ وہ مارکسزم کے معاشی نظام کو قرآن کے معاشی نظام کے مماثل سمجھتے تھے لیکن اس کے فلسفۂ حیات کو یکسر کفر۔ اور چونکہ کمیونزم میں اس کے فلسفۂ حیات کو اس کے معاشی نظام سے الگ نہیں کیا جا سکتا اس لئے کمیونزم ان کے نزدیک کبھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتا تھا۔ انہوں نے کھلے لفظوں میں اس کی وضاحت بہت پہلے کر دی تھی۔ بات یوں ہوئی کہ جب انہوں نے (بانگِ درا اور پیامِ مشرق میں) نظامِ سرمایہ داری کے خلاف لکھا تو ایک صاحب، شمس الدین حسن نے، جو کمیونزم کے بہت بڑے حامی (اور ہفتہ وار اخبار، انقلاب اور خاور کے ایڈیٹر رہ چکے تھے)۔ روزنامہ زمیندار (لاہور) کی اشاعت بابت ۲۲ جون ۱۹۲۳ء میں ایک مضمون لکھا:۔

> بالشویک خیالات کا حامی ہونا جرم ہے تو پھر ہمارے ملک کا سب سے بڑا شاعر، اقبالؒ، قانون کی زد سے کس طرح بچ سکتا ہے۔ بالشوزم، کارل مارکس کے فلسفۂ سیاسیات کا لبِ لباب ہے اور اسی کو عام فہم زبان میں سوشلزم اور کمیونزم کہا جاتا ہے۔ اقبالؒ کی نظم ——— خضرِ راہ ——— اور ان کے مجموعہ کلام، پیامِ مشرق، کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ، ایک اشتراکی ہی نہیں بلکہ اشتراکیت کے مبلغِ اعلیٰ ہیں۔

اس کے جواب میں حضرت علامہؒ کا، ۲۴ جون ۱۹۲۳ء کے زمیندار میں خط شائع ہوا جس میں انہوں نے تحریر فرمایا کہ

> (۱) میرے افکار کو بالشوزم سے منسوب کرنا غلط ہے۔ بالشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرۂ اسلام سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے۔
>
> (۲) میں مسلمان ہوں اور میرا عقیدہ ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین حل، قرآنِ مجید نے تجویز کیا ہے۔

(۳) روسی بالشوزم یورپ کی ناعاقبت اندیش اور خود غرض سرمایہ داری کے خلاف ایک زبردست ردِ عمل ہے۔ لیکن مغرب کی سرمایہ داری اور روس کا بالشوزم دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں۔ اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے ہم کو بتائی ہے۔

(بحوالہ۔ اقبالؒ اور قرآن۔ صفحہ ۱۹۰)

اس کے بعد انہوں نے ۱۹۳۶ء میں، خواجہ غلام السیدین کے نام ایک خط میں لکھا:۔

سوشلزم کے مغرب ہر جگہ روحانیت اور مذہب کے خلاف ہیں اور اسے افیون تصوّر کرتے ہیں۔ لفظ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں، اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریخِ انسانی کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں، مگر روحانیت کے قرآنی مفہوم کا ..... جو روحانیت میرے نزدیک مغضوب یعنی افیونی خواص رکھتی ہے، اس کی تردید میں نے جا بجا کی ہے۔ باقی رہا سوشلزم، سو اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے جس سے مسلمان سوسائٹی نے بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔ (مکاتیبِ اقبالؒ)

اس سے سوشلزم اور اسلام کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے، اور یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ سوشلزم کا فلسفۂ حیات ماننے والا، مسلمان نہیں ہو سکتا۔

انہوں نے اپنی وفات سے ایک سال پہلے، قائداعظمؒ کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ

شریعتِ اسلامیہ کے طویل و عمیق مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اسلامی قانون کو معقول طریق پر سمجھا اور نافذ کیا جائے تو ہر شخص کو کم از کم عام معاش کی طرف سے اطمینان ہو سکتا ہے ..... اسلام کے لئے سوشل ڈیماکریسی کی کسی موزوں شکل میں ترویج، جب اسے شریعت کی تائید و موافقت حاصل ہو حقیقت میں کوئی انقلاب نہیں بلکہ اسلام کی حقیقی پاکیزگی کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

ان حقائق سے واضح ہے کہ علامہ اقبالؒ سوشلزم کے فلسفۂ حیات کو اسلام کی نقیض قرار دیتے اور اس کے شدید مخالف تھے اور وہ قرآن کے معاشی نظام کو (جو سوشلزم کے معاشی نظام کے مماثل ہے) نوعِ انسان کی مشکلات کا حل قرار دیتے تھے۔ لہٰذا اقبالؒ کو کمیونسٹ کہنا بڑی زیادتی ہے۔

ضرورت رشتہ

مشرقی ماحول کی پروردہ دہلی کے ایک معروف خاندان کی دوشیزہ لڑکی کے لئے جس کی عمر قریب ۲۵ سال اور تعلیم "بی فارمیسی" تک ہے، کسی برسرِ روزگار گریجویٹ یا ڈاکٹر کا رشتہ مطلوب ہے۔ دیگر کوائف معلوم کرنے کے لئے لکھئے۔

(م ـ ا) معرفت ـ ادارہ طلوعِ اسلام
۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

اللہ تعالےٰ کا محیر العقول نظامِ ربوبیت

(ڈاکٹر سید عبدالودود)

محترم ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب نے قرآن کریم کی بلند پایہ علمی اصطلاحات کا مفہوم، سائنٹفک تحقیقات کی روشنی میں، واضح کرنے کا جو انداز اختیار فرمایا ہے وہ انتہائی دلچسپ بھی ہے اور معلومات افزا بھی۔ اسی بنا پر قارئین نے اس سے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ زیرِ نظر قسط میں انہوں نے اللہ تعالےٰ کے محیر العقول نظامِ ربوبیت کے بعض دقیق گوشوں کی نقاب کشائی کی ہے۔ طلوعِ اسلام)

★

میں نے اپنے سابقہ مقالہ میں (جو طلوعِ اسلام بابت مارچ ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا ہے) آیات $\frac{41}{9-12}$ کے ان گوشوں کے متعلق گفتگو کی تھی جن کا تعلق تخلیقِ ارض و سماوات سے تھا۔ ان آیات میں کچھ اہم نکات نظامِ ربوبیت سے بھی متعلق ہیں۔ اب میں ان کے متعلق اپنی تحقیق کے نتائج پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔ بِیَدِہِ التَّوْفِیْقُ۔

(۱) بَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا (۴۱/۱۰) جیسا کہ میں اپنے سابقہ مقالہ میں بیان کر چکا ہوں، یہ الفاظ زمین کے بے جان مادہ میں زندگی کی نمود سے متعلق ہیں۔

بَارَكَ کا لفظ بڑا جامع ہے۔

اس کے معنی ایسے ثبات کے ہیں جس کے ساتھ نمو بھی ہو۔ یعنی ایک چیز اپنے مقام پر مستحکم بھی ہو اور ساتھ ہی بڑھ بھی رہی ہو اور اس کی مضمر صلاحیتیں نمودار ہو کر سامنے آ رہی ہوں۔ چنانچہ لفظ "مبارکۃ" میں ثبات۔ استحکام۔ کثرت نشوونما۔ اور ظہور و نمود کے تمام پہلو آ جاتے ہیں۔ (لغات القرآن از پرویز)

سائنس آف بائیالوجی (علم الحیات) کی ایک اصطلاح ہے (SELF PERPETUATION) جس کے معنی بعینہٖ وہی ہیں جو لفظ "برکت" کے ہیں۔ یہ سوال ابھر کر سامنے آتا ہے کہ زندہ اشیاء میں وہ کیا قدرِ مشترک ہے جس سے پہچانا جا سکے کہ یہ اشیاء زندہ ہیں۔ جہاں تک کیمیائی عناصر کا تعلق ہے وہ زندہ اور بے جان اشیاء میں ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ زندہ شئے چاہے ایک جرثومہ (CELL) پر مشتمل ہو چاہے اربوں (CELLS) پر، ان سب کے افعال (ACTIVITIES) ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ یعنی:-

(۱)۔ (NUTRITION)۔ اپنے ماحول سے خام مادے کا حصول۔

(۲)۔ (RESPIRATION)۔ اپنے ماحول سے انرجی (توانائی) کا حصول۔

(۳)۔ (SELF-REPAIR) خام مادے (غذا) اور انرجی کے ذریعے اپنے جسم کے اجزائے سرے سے

تیار کرنا۔ ٹوٹے پھوٹے کی مرمت کرتے جانا۔

(۴) (GROWTH)۔ نئے تیار کردہ اجزا سے جسم کا بڑھنا۔

(۵) (DEVELOPMENT)۔ نئے اجزا کے ذریعے نئی خصوصیات کا پیدا ہونا۔

(۶) (REPRODUCTION) (تولید)۔ یعنی اپنی مثل ایک نیا جسم پیدا کرنا۔

(۷) (ADAPTATION)۔ یعنی بدلے ہوئے ماحول میں اپنے جسم میں تبدیلی پیدا کر کے اپنی بقاء کی خاطر نئے ماحول کا مقابلہ کرنا۔

ان افعال کو دو گروپوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ۱۔ (METABOLISM) اور ۲۔ (SELF-PERPETUATION) (METABOLISM) میں خام مادہ کا حصول، انرجی کا حصول اور جسم کے اجزا کی تعمیر شامل ہیں۔ اس میں سے کچھ انرجی جسمانی ساخت کی تعمیر میں خرچ ہوتی ہے اور باقی (SELF-PERPETUATION) کے کام آتی ہے۔

اب آپ غور کیجئے کہ اگر ایک مشین کو خام مال اور انرجی (پٹرول یا کوئلہ یا بجلی) مہیا کر دی جائے تو مشین بھی اپنے پرزے خود تیار کر سکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ صرف (METABOLISM) ایسا فعل نہیں جس سے زندہ چیز بے جان چیز سے متمیز ہوتی ہے۔ دراصل امتیازی فعل (SELF-PERPETUATION) ہے۔

(SELF-PERPETUATION) میں تین افعال پر مشتمل ہے۔ (۱) (STEADY STATE CONTROL) (2) REPRODUCTION تولید۔ اور (3) (ADAPTATION) بدلے ہوئے ماحول کے مطابق بدلنا۔

ایک جاندار کے اندر بے شمار پیچیدہ کنٹرول سسٹم ہوتے ہیں جن کے ذریعے وہ اپنے داخلی اور خارجی ماحول سے آگاہ رہتا ہے۔ اسے یہ آگہی محرکات (STIMULI) کے ذریعے حاصل ہوتی ہے جن کا ردِ عمل (SELF-PRESERVATION) یعنی تحفظ خویش کی شکل میں ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے جسم میں جب غذا ختم ہو جاتی ہے، تو بھوک لگتی ہے، پانی ختم ہو جائے تو پیاس لگتی ہے۔ جس کام کے کرنے میں زیادہ قوت صرف ہو اس سے آکسیجن ختم ہو جاتی ہے جسے حاصل کرنے کے لئے سانس تیز ہو جاتا ہے۔ جسم خوراک، پانی، آکسیجن اسی قدر حاصل کرتا ہے جس قدر اسے ضرورت ہوتی ہے۔ ضرورت پوری ہو جانے کے بعد بھوک پیاس بھی ختم ہو جاتی ہے اور تنفس بھی معمول پر آ جاتا ہے۔ (اس "بقدرِ ضرورت" حصول کو پیشِ نظر رکھئے تاکہ آگے چل کر لفظ "اقوات" کے معنی واضح ہو جائیں)

REPRODUCTION۔ (STEADY STATE CONTROL) کے باوجود ہر جاندار کی طبیعی زندگی کی ایک حد ہے، کیونکہ (CONTROL SYSTEMS) میں (WEAR AND TEAR) بوسیدگی اور فرسودگی کا عمل ہر وقت جاری رہتا ہے۔ اگر چند ایک کنٹرول سسٹم خراب ہو جائیں، تو جاندار بیمار ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں باقی سسٹمز (SELFREPAIR) کا کام دیتے ہیں۔ اگر سارے کے سارے کنٹرول سسٹمز خراب ہو جائیں تو اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہاں پھر ایک مشین اور زندہ شے میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ جس طرح مشین ایک عرصہ کے بعد بیکار ہو جاتی ہے اسی طرح جاندار کا جسم بھی بیکار ہو جاتا ہے۔ لیکن جاندار کی زندگی میں ایک ایسا واقع ظہور پذیر ہوتا ہے جو مشین کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ یہ ہے (REPRODUCTION) یا تولید کا عمل۔ گویا تولید کا عمل ایک لحاظ سے موت کا بدل ہے۔ اس کے ذریعے زندگی آئندہ نسلوں میں جاری رہتی ہے۔ یعنی فردِ متعلقہ کی طبیعی زندگی نہیں بلکہ محض زندگی . . . . . .

(LIFE-ADAPTATION) یہ زندگی کے ثبات اور استحکام کو قائم رکھنے کی آخری تدبیر ہے۔ یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ماحول میں جو طویل المیعاد (LONG-RANGE) تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، (STEADY STATE CONTROL) اور عملِ تولید، دونوں مل کر بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مدتِ مدید کے بعد آب و ہوا بدل سکتی ہے۔ زمین کی خشکی تری میں اور تری خشکی میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ جنگل کی جگہ ریگستان اور ریگستان کی جگہ جنگل بن سکتے ہیں۔ فلہٰذا، ایک طویل مدت کے بعد نئی نسلیں بدلے ہوئے ماحول میں زندہ نہیں رہ سکتیں، تاآنکہ ان کے جسم میں ایسی تبدیلی نہ آجائے جو بدلے ہوئے ماحول کا مقابلہ کر سکے۔ یہ تبدیلی (SEX) نر و مادہ کے اختلاط اور (MUTATION) یکسر نئے اجزاء کے معرضِ وجود میں آنے سے پیدا ہوتی ہے۔ (تفصیل میری کتاب میں ملے گی[1])

یہ ہے (SELF PERPETUATION) کا وہ عمل جسے قرآن نے ایک لفظ (برکۃ) میں سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ ہے نا قرآن کا اندازِ بیان اور اس کا اعجاز!

(۲) قَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا اقوات۔ القوت کی جمع ہے۔ لغات القرآن میں اس کے معانی دیئے گئے ہیں۔ "اتنی خوراک جس سے انسان زندہ رہ سکے" (یعنی خوراک کا حصول بقدرِ ضرورت اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے)۔ میں اس مقالہ میں لفظ خوراک یا غذا ہی استعمال کروں گا کیونکہ یہ عام فہم ہے (ورنہ (BIOLOGY) میں (FOOD) اور (NUTRITION) دو الگ الگ اصطلاحات ہیں۔ (NUTRITION) ماحول سے براہِ راست حاصل کی جاتی ہے، جس طرح پودا کرتا ہے لیکن حیوانات اپنی خوراک ماحول سے خام مادہ لے کر تیار نہیں کرتے۔ بعض حیوان پودوں کی شکل میں بنی بنائی خوراک کھاتے ہیں اور بعض دوسرے حیوان کو کھا جاتے ہیں۔ انسان پودے اور حیوان دونوں کو کھاتا ہے۔ پودے اور حیوان کا یہ فرق اسی وقت پیدا ہو گیا تھا جب زندگی منحصر ایک ہی (CELL) پر مشتمل تھی۔ جو (CELLS) اپنی خوراک خود خام مادہ سے تیار کرتے تھے ان کی نسلیں آگے جا کر پودے بن گئیں اور جن (CELLS) کی خوراک کا انحصار دوسرے (CELLS) پر تھا ان کی آئندہ نسلیں حیوانات بن گئیں۔

زمین پر خوراک کے حصول کے طریق مختلف زمانوں اور مختلف ماحول میں بدلتے گئے۔ اللہ کی ربوبیت کی یہ داستان بڑی طویل ہے لیکن میں اسے مختصراً بیان کرتا ہوں۔

زمین کے سورج سے الگ ہونے کے (۵۰۰۰) ملین سال بعد اوّلیں جرثومۂ حیات (LIFE CELLS) پیدا ہوئے۔ جب یہ ایک مرتبہ معرضِ وجود میں آگئے تو ان کی تعداد میں بڑی تیزی کے ساتھ اضافہ ہونے لگا تاآنکہ ایک وقت ایسا آیا کہ سمندروں کے پانی میں خام مادہ جو ان کی خوراک تھی، میں کمی واقع ہو گئی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے (CELLS) نے ایک دوسرے کو کھانا شروع کر دیا۔ اور یہ تین طریقوں سے ہوا۔ (۱) بعض چھوٹے (CELLS) بڑے (CELLS) کے جسم میں داخل ہو کر ان کی خوراک کھاتے رہے۔ اس عمل کا نام (PARASITISM) ہے۔ بعض (CELLS) نے دوسرے مردہ (CELLS) کو کھانا شروع کر دیا۔ (اسے SAPROTROPHISM) کہتے ہیں۔ اور بعض بڑے (CELLS) نے چھوٹے (CELLS) کو کھانا شروع کر دیا اس کا نام (HOLOTROPHISM) ہے۔ لیکن ان تینوں

---

[1] (PHENOMENA OF NATURE AND THE QURAN.)

طریقوں سے زمین کے خوراک کے مجموعی ذخائر میں کوئی اضافہ نہ ہوا۔ ظاہر ہے کہ اگر یہی عمل جاری رہتا تو کچھ عرصہ کے بعد زمین پر سے زندگی ناپید ہو جاتی۔ لیکن رب العالمین کو یہ منظور نہ تھا کیونکہ زندگی نے ابھی بے شمار منزلیں طے کرتے ہوئے آگے بڑھنا تھا۔ چنانچہ زمین پر خوراک کے نئے (SOURCES) کے ارتقاء کا عمل شروع ہو گیا۔ زمین کے اولین (LIFE CELLS) کی خوراک، میتھین۔ ایمونیا اور پانی کے مرکب سے بنی تھی اور اس کی تیاری کے لئے انرجی سورج کی شعاعوں سے اور بادلوں کی بجلی سے لی گئی تھی۔ لیکن بعد ازاں جب فضا کے بخارات ٹھنڈے ہو کر پانی بن گئے اور ہزارہا برس تک مسلسل بارش سے سمندروں کے پانی میں تبدیل ہو گئے تو بادلوں کی بجلی آہستہ آہستہ ناپید یا کم ہو گئی۔ دوسری طرف زمین کے (ATMOSPHERE) میں کاربن ڈائی اوکسائڈ کی تہہ جم گئی جو اس (HIGH ENERGY RADIATION) کے راستے میں جو سورج سے زمین پر آتی تھی روک بن گئی۔ ظاہر ہے جب تک نئی انرجی دستیاب نہ ہو نئی خوراک تیار نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ بعض (CELLS) نے گندھک۔ لوہا اور نائٹروجن کے مرکبات سے انرجی حاصل کرنا شروع کر دی۔ اس عمل کو (CHEMOSYNTHESIS) کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ سورج کی روشنی کی شعاعوں سے انرجی حاصل کرنے کا ایک پیچیدہ لیکن دلچسپ ذریعہ پیدا ہو گیا۔ یعنی ایک مرکب وجود میں آیا جسے (CHLOROPHYLL) کہتے ہیں اور جو آج بھی روشنی کی شعاعوں سے انرجی حاصل کر کے پودے کی ہوا سے حاصل کردہ کاربن ڈائی اوکسائڈ اور زمین سے حاصل کردہ پانی اور نمکیات کو کاربوہائیڈریٹ میں تبدیل کرتا ہے جو پودوں کی خوراک ہے۔ اور پودوں کو حیوان کھاتے ہیں اور پھر حیوان کو حیوان کھاتے ہیں۔ اور انسان پودوں اور حیوانات دونوں کو کھاتا ہے۔ (CHLOROPHYLL) کے ذریعے خوراک تیار کرنے کے طریق کو (PHOTOSYNTHESIS) کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے نظامِ ربوبیت کے چند اور کرشمے ملاحظہ فرمائیے۔ مچھلی اور مینڈک پانی میں انڈے دیتے ہیں۔ ان انڈوں کے اندر خوراک کا کوئی ذخیرہ نہیں ہوتا جس سے جنین کی نشوونما ہو سکے۔ ان کی خوراک پانی کے اندر موجود ہوتی ہے جہاں سے وہ اسے براہِ راست حاصل کرتے ہیں۔ اسی لئے ان انڈوں کے گرد خول نہیں ہوتا کیونکہ انڈے کے اندر کا پانی خشک ہونے کا احتمال نہیں ہوتا اس سے اوپر کی سطح کے جانور (REPTILES)۔ رینگنے والے جانور اور پرندے ہیں۔ ان کے انڈے چونکہ خشکی پر ہوتے ہیں اس لئے ان کے سوکھ جانے کا احتمال ہوتا ہے۔ بنا بریں ان کے اوپر خول بن گیا۔ خول والے انڈے چونکہ اپنے ماحول سے براہِ راست خوراک حاصل نہیں کر سکتے اس لئے ان کے اندر جنین کی پرورش کے لئے غذا کا بڑا ذخیرہ موجود ہوتا ہے، جس طرح مرغی اور بطخ کے انڈے کی زردی اور سفیدی ہے۔ علاوہ ازیں خود انڈے کا خول بھی اللہ کے نظامِ ربوبیت کا عجیب کرشمہ ہے۔ خول کے اندر سے انڈے کا پانی بخارات بن کر باہر نہیں آ سکتا لیکن خول میں مسام ہوتے ہیں جن کے ذریعے باہر سے آکسیجن خول کے اندر داخل ہو سکتی ہے۔ اب اس سے اوپر کے درجہ کی طرف آئیے۔ دودھ دینے والے جانوروں کا انڈا چونکہ رحمِ مادر میں نشوونما پاتا ہے اس لئے اس کے گرد خول کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور اس انڈے کے اندر جنین کی پرورش کے لئے خوراک بھی نہایت قلیل مقدار میں ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر انسان کے (OVUM) کو لیجئے۔ اس کی (FERTILISATION) (یعنی مرد کے (CELL) سے اختلاط) (FALLOPIAN TUBE) کے اندر ہوتی ہے۔ ٹیوب سے رحم تک پہنچنے کے لئے ایک ہفتہ درکار ہوتا ہے۔ جب یہ رحمِ مادر کے اندر اپنی جگہ پکڑ لیتا ہے تو جنین

کی خوراک براہِ راست ماں کے خون سے ملنی شروع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ انسانی (OVUM) کے اندر خوراک کی مقدار اتنی ہی ہوتی ہے جو چند دنوں کے لئے کافی ہو۔ جب جنین رحمِ مادر کے اندر اپنے قیام کی مدت پوری کر لیتا ہے تو ماں کا دودھ تیار ملتا ہے۔

اسی طرح پانی کی طرف دیکھئے۔ سمندر کے پانی میں نمکیات اتنے زیادہ ہوتے ہیں (ملحٌ اجاج) کہ اسے زبان پر رکھنا بھی محال ہوتا ہے۔ سورج کی گرمی سے یہ پانی بخارات بن کر ہوا میں اڑ جاتے ہیں۔ ہوا میں ٹھنڈے ہو کر بخارات جم جاتے ہیں۔ پھر بارش برستی ہے اور صاف ستھرا میٹھا پانی (عذبٌ فرات) جانداروں کو پینے کے لئے ملتا ہے۔ یہ پانی ندیوں اور دریاؤں میں زمین کے ساتھ رگڑ کھاتا ہوا نشیب کی طرف آتا ہے تو اس میں نمکیات پھر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اور یوں پانی "عذب فرات" سے پھر "ملح اجاج" بن جاتا ہے۔ اگر سورج کی حرارت سے پانی کے اوپر چڑھنے کا عمل اور (GRAVITY) کے ذریعے پانی کے نیچے اترنے کا عمل جاری نہ رہے تو زمین کا سارا پانی (ملحٌ اجاج) بن جائے اور زمین پر سے زندگی ناپید ہو جائے۔ اسی لئے ربّ العالمین نے فرمایا:-

أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ ۝ أَأَنتُمْ أَنزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنزِلُونَ ۝
لَوْ نَشَاءُ جَعَلْنَاهُ أُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ (۵۶ : ۶۸ - ۷۰)

"پھر اس پر غور کرو کہ جس پانی کو تم پیتے ہو اس کو بادلوں سے تم برساتے ہو یا ہمارا قانونِ ربوبیت برساتا ہے۔ اگر ہم اسے کھاری بنا دیتے تو تم کیا کرتے! تو پھر تم شکر گزار کیوں نہیں ہوتے؟ (۵۶ : ۶۸ - ۷۰)

قَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا کی داستان طویل ہے۔ میں نے صرف چند نمونے پیش کئے ہیں۔ بَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا کے الفاظ کو سامنے رکھ کر غور کیجئے۔ انسان کے دل سے بیساختہ آواز اٹھتی ہے کہ: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ -

قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی (معطیان کی خدمت میں)

(۱) سنٹرل بورڈ آف ریونیو حکومت پاکستان کے نوٹیفکیشن (SRO N⁰:1654(K)/65) مؤرخہ ۴ اگست ۱۹۶۵ء (جو حکومت پاکستان کے سرکاری گزٹ، پارٹ II، مؤرخہ ۱۳ اگست ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا تھا) کی رو سے قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کو دیئے جانے والے عطیات انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں۔

(۲) ہم معذرت خواہ ہیں کہ طلوعِ اسلام میں جگہ کی قلت کے باعث بزموں کی معرفت عطیات بھیجنے والے احباب کے نام فوراً شائع نہیں کئے جا رہے ہیں بلکہ ایسے عطیات کی رقوم متعلقہ بزموں کے نام سے شائع کی جا رہی ہیں۔ البتہ ان معطیان کی رسیدیں الگ الگ کاٹی گئی ہیں اور متعلقہ بزموں کو بھیج دی گئی ہیں یہی طریقہ آئندہ بھی اختیار کیا جائے گا۔

(۳) طلوعِ اسلام بابت فروری ۱۹۸۰ء میں محترم مقصود حسین کیانی صاحب (جنہیں کچھ رسیدیں جاری کر کے عطیات وصول کرنے کے لئے کہا گیا ہے) کا پتہ قدرے غلط چھپ گیا ہے۔ درست پتہ حسبِ ذیل ہے:-

MR M.H.KIYANI, 203, BYRON AVE, MANOR PARK, LONDON, E12. 6HJ

(شیخ) سراج الحق۔ سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی